تاریخ

ریاست سوات

مؤلفہ

اللہ بخش یوسفی

ناشران: محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی کراچی ۵



تاریخ

ریاست سوات

《 مولف 》

اللہ بخش یوسفی

مصنف سلسلہ تاریخ آزاد پٹھان

(ناشران)

محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی

اقبال کالونی کراچی ۵

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جوہر پبلکیشنز نمبر ــــــــــ پہلا ایڈیشن

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

شوکت علی یوسفی نے عباسی لتھو آرٹ پریس فریرر روڈ کراچی
سے چھپوا کر دفتر محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی اقبال کالونی
تین ہٹی کراچی نمبر ۵ سے شائع کی۔

ایجنسی



عظیم پبلشنگ ہاؤس
۲۷ نیو مارکیٹ کابلی گیٹ
پشاور شہر



معنون

بنام

میجر جنرل عبدالحق جہانزیب خان

والئے ریاست سوات

پاکستان



میجر جنرل عبدالحق جہانزیب خان

والئ ریاست سوات

مندرجات

مندرجات

کتاب کی تصاویر


افتتاحیہ



اللہ بخش یوسفی

افتتاحیہ

سوات اپنے قدرتی مناظر۔ فراوانی آب۔ سرسبز پہاڑی اور میدانی علاقوں کی وجہ سے بلاشبہ پاکستان کا خوبصورت ترین حصہ شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس تمام دلکشی اور خوبصورتی کے باوجود تاریخ کے کسی دور میں بھی وہاں کسی دیرپا حکومت کے قیام کا پتہ نہیں چلتا اور یہ کچھ سوات پر ہی منحصر نہیں۔ پورے قبائلی علاقہ میں شاید روز آفرینش سے کوئی منظم حکومت قائم نہ ہو سکی تھی۔

سوات کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس خطہ ارضی کا ذکر قدیم ترین کتابوں میں مرقوم دکھائی دیتا ہے۔ اسے گلزار یا گلستان کے ہم معنی ناموں سے پکارا جاتا رہا۔ اور اس کی یہ خوبصورتی اور دلربائی ہی حقیقتاً بیرونی حملہ آوروں کو اس طرف رخ کرنے کی رغبت دلاتی رہی۔ اس کی دلکشی خود اس کے لئے وبال جان بنی۔ کبھی ایرانیوں نے اسے لتاڑا تو کبھی یونانیوں

نے اس طرف یلغار کی۔ بدھ مت کو بھی یہی علاقہ مرغوب رہا تو مہاتما بدھ کی کئی روایات کو اس سرزمین سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔

سوات میں جہاں تک کسی حکومت کے قیام کا تعلق ہے۔ اول بار اس کا ایک خاکہ عہد بدھ مت میں دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت اس علاقہ میں سڑکوں کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ نئی نئی آبادیاں بسائی گئی تھیں یا پھر اس کے بعد تھوڑے سے عرصہ کے لئے ہندوشاہیہ نے اس سرزمین پر ایسے وقت اپنا پرچم لہرایا کہ جس وقت قبیلہ یوسف زئی موجودہ علاقہ سے بہت دور افغانستان اور بلوچستان کے درمیانی علاقوں میں نظر آ رہا تھا۔ ہندوشاہیہ کا چراغ زیادہ دیر تک جل نہ سکا تو سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہو جانا پڑا۔

سوات کی سرزمین ایسے ہی حالات سے ہمکنار ہوتی رہی۔ وقت گزرتا گیا۔ مغل درانی، سکھ اور انگریز ہر ایک نے اپنی طاقت آزما دیکھی لیکن ان میں کا کوئی ایک خاندان بھی اپنی حکومت قائم نہ کر سکا تا آنکہ حضرت اخوند صاحب (سوات) (بابائے سوات) کی اولاد سے حضرت میاں گل عبدالودود نے ۱۹۱۵ء میں ایک منظم حکومت کی بنیاد ڈالی جس نے دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے ہوئے سوات جدید کے نام سے اپنے آپ کو دنیا سے روشناس کرایا اور ایسا اعلیٰ نظم و نسق قائم کیا کہ جس پر جس قدر بھی فخر و مسرت کا اظہار کیا جائے بے جا نہ ہوگا یہ اوراق اسی سوات جدید کے متعلق لکھے جا رہے ہیں۔

ریاست سوات



سکندر اعظم



بدھ مت کے بانی گوتم بدھ

87074

ریاست سوات

ریاست سوات اس قدیم علاقہ کا ایک حصہ ہے کہ جسے مورخین نے گندھارا کے نام سے پکارا تھا۔ جس کے اذکار سے ابتدائی دور کی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ جس کی تاریخ خاص اہمیت رکھتی ہے جسے کوئی مورخ نہ تو نظر انداز کر سکا اور نہ کر سکتا تھا۔ یونانیوں نے اسے گنداریا (GANDARIA) کے نام سے موسوم کیا۔ اور اس وقت کے محل وقوع کے لحاظ سے اس میں دریائے النگر سے دریائے سندھ اور کوہ سفید سے کوہاٹ کی پہاڑیوں تک کا علاقہ شامل تھا۔ یا یوں کہئے کہ ضلع پشاور۔ ضلع مردان۔ درہ کوہاٹ۔ علاقہ مہمند، باجوڑ سوات اور بونیر کو ملا کر گندھارا پکارا جاتا تھا۔

اس علاقہ کو قدیم سے ہی ایک مستقل صوبہ کی حیثیت حاصل رہی۔ خواہ وہ آزاد رہا یا محکوم۔ اور مختلف اوقات پر

چارسدہ۔ پشاور۔ اور ہنڈ وغیرہ نے جو اس وقت ان ناموں سے موسوم یا مشہور نہ تھے۔ اس کے دارالسلطنت کے طور اپنے قدیم ناموں سے شہرت حاصل کی تھی۔

نام قدیم کتب میں سوات کا ذکر اددیانہ ODYANA کے نام سے دکھائی دیتا ہے۔ جو پراکرت (سنسکرت) میں ادجیانہ پکارا جاتا رہا۔ جس کے معنے باغ۔ گلستان یا پارک نما جگہ کے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قدیم علاقہ کو زمانہ قدیم سے ہی اپنی خوبصورتی۔ دلکشی اور قدرتی مناظر کی وجہ سے اہمیت و شہرت حاصل رہی ہے۔ اور یہی شہرت مختلف اقوام کو اس طرف دیکھنے یا اقدام پر آمادہ کرنے کا باعث بنی۔

دور سکندر اعظم کے یونانی مورخین نے اپنی رسم کے مطابق اس علاقہ کا ذکر اس کے دریا کی نسبت سے کیا۔ جو اس وقت دریائے سوات اور اس عہد قدیم میں سواستو SAWASTU پکارا جاتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لفظ سوتیا SWETA سے مشتق ہے جس کے معنے سفید یا شفاف پانی کے ہیں۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے بھی سفید یا شفاف پانی کا ذکر کیا ہے۔ گیارویں صدی عیسوی میں مشہور مورخ البیرونی بھی شفاف پانی کا ذکر کرتا ہے اور آج بھی دریائے سوات کے صاف و شفاف چاندی کی طرح

چمکتے ہوئے اس پانی کو دیکھا جائے تو کچھ عجیب سی مسرت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس دریا کے قرب میں جب سپین ادبو (سفید پانی) نامی کوئی بستی بھی دکھائی دے رہی ہو تو پھر اس کے سواستو یا سوتیا پکارے جانے پر کسی طرح تعجب نہیں ہوتا۔ اور یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس علاقہ کو اس کے صاف و شفاف پانی سے بھرپور ندی نالوں ہی کی وجہ سے سواستو یا سوتیا پکارا گیا ہوگا۔ جو بعد میں چل کر سواد جیسا بابر کی تحریروں میں درج ہے اور پھر سوات بن گیا۔

سکندر اعظم کی یلغار

سکندر اعظم سے قبل سوات کی شہرت قدیم الایام سے سنی جاتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کی قدیم مقدس کتاب رگ وید میں بھی اسے اودیانہ کے نام سے جگہ ملی۔ پھر جب واقعات و حالات کو ضبط تحریر میں لانا ضروری خیال کیا گیا۔ یا ان کے لکھنے کا آغاز یا رواج شروع ہوا۔ تو سوات سے متعلقہ اذکار نمایاں حیثیت میں تاریخ کے اوراق پر منقش ہونے لگے۔ ان نقوش کی باقاعدہ ابتداء یونانیوں نے کی اور انہی کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قبل از تدوین تاریخ ہیں سکندر اعظم سے بہت پہلے ہی ایرانی اور یونانی اس طرف کا رخ کر چکے تھے۔ چنانچہ جب سکندر نے اس علاقہ کو روند ڈالا۔ تو اس علاقہ میں نیسا کے باشندوں نے اپنے کسی اکل فیس (AKUL PHIS) نامی سردار یا حکمران کی زیر قیادت حاضر ہو کر

سکندر اعظم کے سامنے یوں درخواست گزاری تھی کہ

اے شاہ۔ نیسا کے باشندے مودبانہ عرض گزار ہیں کہ اس احترام کے پیش نظر کہ جو نوان کے معبود ڈائے نے سس کے لئے (اپنے دل میں) رکھتا ہے۔ اس شہر کو صحیح و سلامت چھوڑ دے ...... کیونکہ بکوس نے .... اس شہر کو اپنے ان سپاہیوں کے رہنے کے لئے کہ جو عمر یا حادثوں کی وجہ سے فوجی ملازمت کے قابل نہ رہے تھے آباد کیا تھا .... وہ اس شہر کو اپنی نرس (دایہ) کے نام کی نسبت سے نیسا (نوسن) پکارتا تھا..... ساتھ ہی اس پہاڑی کو بھی کہ جو ہمارے قریب ہے۔ اس نے مشتری سے پیدائش کی وجہ سے میرون کے نام سے پکارا تھا....... اور اس شہر کی بکوس کے ہاتھوں بنیاد رکھنے کا بین ثبوت یہ ہے کہ سدا سرسبز ولائتی بیل (۱۷۶) جو ہندوستان بھر میں کہیں دستیاب نہیں ہوتی ہمارے علاقہ میں پھلتی پھولتی ہے۔

(انڈیکا۔ ایرین)

سکندر اعظم کی یلغار اس وقت کہ ایران پر دارا سویم حکومت کر رہا تھا۔ سکندر اعظم نے اس طرف کا

رخ کیا اور ایران۔ افغانستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان کی راہ لی تھی۔ افغانستان سے روانگی کے وقت یونانی لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ لشکر نے درۂ خیبر کے راستہ پشاور کا رُخ کیا۔ جس کی راجدھانی اس وقت پیو کی لوتیس (PEUKELOOTIS) پکاری جاتی تھی جسے بعد میں چل کر محققین نے چارسدہ (ضلع پشاور) کے مقام پر آباد بتایا۔ دوسرا حصہ لشکر نے خود سکندر اعظم کی قیادت میں کنڑ کے راستہ سے اقدام جاری رکھا۔ یہ راستہ خیبر سے دور بجائے خود قدیم و مشہور راستہ شمار ہوتا تھا اور زمانہ قدیم میں آمد و رفت زیادہ تر اسی راستہ سے ہوا کرتا تھا۔

سکندر اعظم باجوڑ میں

وادی کنڑ (افغانستان) سے نکل کر سکندر علاقہ باجوڑ (پاکستان) میں داخل ہوا۔ یہاں کے باشندے جو تاریخ میں اسپاسین ASPASIANS پکارے جاتے ہیں۔ مقابلہ کے لئے موجود تھے۔ ارگائن[1] ARIGAION کے مقام پر شدت کی جنگ لڑی گئی۔ جو مورخین کے خیال میں سرزمین پاکستان پر سکندر کی اولین جنگ عظیم تھی۔ سکندر کے ساز و سامان۔ اس کے نظم و نسق۔ سامان کی

---

[1] ارگائن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لواگی کے قریب کوئی آبادی تھی۔ (گلشن آف انڈیا)

فراوانی۔ اور منظم لشکر کے سامنے مقامی باشندے ٹھہر نہ سکے تو انہوں نے آرگائن کو ہی نذر آتش کر دیا۔ سکندر کے افسر اطلاعات "ٹالمی" PTOLEMY کے بیان کے مطابق سکندر نے اس جگہ کے چالیس ہزار باشندوں کو قیدی بنایا اور دو لاکھ تیس ہزار بیل اپنے قبضہ میں کر لئے۔ جن میں کی چیدہ تعداد کو افزائش نسل کے لئے یونان بھیج دیا گیا تھا۔ ارگائن کے محل وقوع کے پیش نظر سکندر نے اسے دوبارہ تعمیر کرنے کی ہدایت کی اور اصل باشندوں کو جو واپس آنے پر رضامند تھے اور اپنے لشکر کے ان افراد کو جو مستقبل میں فوجی خدمات دینے کے قابل نہ تھے اس جگہ آباد کر دیا تھا۔

اساکینیوں سے پہلی جنگ اس کے بعد سکندر اعظم کو سوات کی ایک اور مضبوط طاقت سے مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ ستمبر ۳۲۷ قبل مسیح میں دوبارہ دریائے پنجکوڑہ کو عبور کرتے ہوئے قبیلہ اساکین ASSAKEUIAN کے جا مقابل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قبیلہ کا سردار بیس ہزار سوار اور تیس ہزار پیادہ لشکر لئے مقابلہ پر نظر آنے لگا۔ قلعہ مساگا MASSAGA کے سامنے میدان کارزار گرم ہوا۔ جو قدرتی اور انسانی تعمیر کردہ تحفظات کا بہترین نمونہ بیان کیا جاتا تھا. اس کے مشرق کی طرف دریائے سوات۔ جنوب اور مغرب کی

کی طرف سنگلاخ چٹانیں اور گہری دلدلیں۔ اس کے ساتھ حملہ آوروں کو روکنے کے لئے ارد گرد اینٹ پتھر اور لکڑی کے کوئی چار میل کے رقبہ میں تحفظات بنے ہوئے تھے۔ طرفین نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ شدید جنگ لڑی گئی۔ کنٹر (افغانستان) کے بعد سکندر اعظم دوسری بار یہاں زخمی ہوا۔ شروع میں تو اس نے زخم کو کوئی اہمیت نہ دی۔ لیکن جب خون کی گرمی کم ہوئی اور درد نے بے قرار کیا۔ تو وہ چلا اٹھا کہ لوگ اسے مشتری کا بیٹا پکارتے تھے۔ لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی حیثیت ایک عام انسان کی سی تھی۔

اس مقابلہ میں اساکین قبلہ کا سردار مارا گیا۔ قبیلہ میں بے چینی پیدا ہوئی۔ چنانچہ کیورلیس (CURIUS) لکھتا ہے کہ

نا امید ہو کر باشندے قلعہ بند ہو بیٹھے۔ جہاں ان کے لئے اطاعت کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ انہوں نے ایلچی بھیجکر صلح کی درخواست کی۔ اور جب وہ قبول کر لی گئی۔ تو ملکہ بڑی تعداد میں معزز بیگمات کو ساتھ لئے خود حاضر ہوئی جو سنہری پیالوں میں شراب دان کرتی رہیں۔ ملکہ نے اپنے خورد سال بچے کو سکندر کے قدموں میں ڈال دیا اور نہ صرف معافی کی طلبگار ہوئی بلکہ اس نے یہ بھی درخواست

کی کہ اس کے سابق اعزاز کو برقرار رہنے دیا جائے کیونکہ وہ ملکہ کہلاتی تھی۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سکندر نے یہ بخشش اس کے مصائب کو دیکھ کر نہ کی تھی۔ بلکہ اس کا محرک ملکہ کا حسن و جمال تھا۔

...... بعد ازاں ملکہ کے ہاں ایک لڑکا بھی پیدا ہوا جس کا نام سکندر رکھا گیا۔

اس قلعہ کے اساکینی لشکر میں سات ہزار ہندوستانی سپاہی بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ فتح کے بعد سکندر نے انہیں اس شرط پر معاف کر دیا کہ وہ اس کے لشکر میں شامل ہو کر خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ اس قلعہ سے کوئی نو میل دوران کے لئے کیمپ نصب ہوا۔ لیکن بعد میں چل کر سکندر نے ان پر حملہ کر دیا۔ تو وہ جان توڑ کر لڑے اور عزت کی موت کو غلامی کی ذلت پر فوقیت دیتے ہوئے ایک ایک کر کے سب کٹ گئے۔ سکندر کے اس کیمپ پر حملہ کرنے کی وجوہات پر مورخین میں اختلاف رہا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سکندر جیسا بہادر حکمران کسی طرح ایفائے عہد سے انحراف نہ کر سکتا تھا۔ بعض لکھنے والوں کی رائے میں ہندوستانی لشکر کسی بیرونی طاقت کا آلہ کار بن کر اپنے وطن کو غلام بنانے کی حرکت کو پسند نہ کر سکا تو اس نے سکندر کے خلاف سازش کی جس کا اسے پتہ چل گیا۔ تو قبل اس کے کہ اس

کیمپ سے کوئی حرکت ہوئی اس نے اچانک حملہ کر دیا تھا۔

مساگا کا محل وقوع بھی دوسرے مقامات کی طرح مورخین کے زیر بحث رہا ہے۔ بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ یہ مقام نواگئی سے کچھ فاصلہ پر تمکانئے کے مقام پر یا اس کے گرد و نواح میں آباد تھا۔ لیکن تاریخ ہند کے مصنفین[1] اسے منگلور کے مقام پر ظاہر کرتے ہیں۔ منگلور ریاست سوات کے دارالسلطنت سیدو شریف سے بحرین جاتے ہوئے سڑک کے دائیں کنارے سے کچھ ہٹ کر پہاڑیوں کے اندر اس وقت ایک گاؤں کی شکل میں آباد نظر آتا ہے۔ اس کے قریب مٹی کی ایک قدیم ڈھیری بھی ہے۔ جس کی کھدائی سے سکندر اعظم کے وقت کے سکے وغیرہ بھی ملے تھے۔ قدیم سیاحوں کی تحریروں اور گیتوں وغیرہ میں بھی منگلور کے اذکار ملتے ہیں۔ اور محل وقوع کے لحاظ سے ان تفصیلات کا متحمل ہے کہ جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

ریاست اورا یا نورہ اور بازیرہ مساگا سے چل کر سکندر اعظم کو اورا یا نورہ ORA OR NORA اور بازیرہ (BAZIRA) نامی دو چھوٹی ریاستوں سے نپٹنا تھا۔ یہ دونوں ریاستیں ایک دوسرے سے متصل اور باہمی امداد و اعانت پر بھروسہ رکھتی تھیں۔ ریاست بازیرہ کے باشندوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ لیکن جب وہ یونانیوں کی فوجی چالبازیوں

---

[1] تاریخ ہند جکسن سمتھ

کا شکار ہو کر کمین گاہوں کو چھوڑ کھلے میدان میں آ مقابل ہوئی تو مد مقابل ثابت نہ ہوئی یونانی لشکر کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہوگیا اور جب اورا سے متوقع امداد بھی بروقت مل نہ سکی تو بھاگ کھڑے ہوئے ادھر سکندر اسی دوران میں اورا پر حملہ آور ہو کر اس پر قابض ہوگیا مذکورہ ریاستوں کے باشندوں نے شکست کے باوجود اطاعت قبول نہ کی اور ملک کو ہی خیر باد کہتے ہوئے کوہ ارنوس (AORNOS) کی طرف چل دیئے۔

زمانہ قدیم کی ان آبادیوں اور بدلے ہوئے حالات کے بدلے ہوئے ناموں میں تطابق پیدا کرنے کے لئے اکثر مشکلات پیش آتی رہیں۔ چنانچہ اورا اور بازیرہ بھی جب زیر بحث آئے۔ تو ماہر آثار قدیمہ مسٹر کننگھم نے بازیرہ کو اس جگہ بتایا کہ جہاں اس وقت ضلع مردان کا موضع رستم آباد ہے۔ اور چونکہ یہ جگہ سوات اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے۔ اس وجہ سے اس کی اہمیت سے انکار نہ کیا جا سکا۔ اور اگر مسٹر کننگھم کے اس خیال کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اورا کو اس جگہ آباد ہونا چاہیئے کہ جہاں ان دنوں ضلع مردان میں موضع بازار آباد ہے۔

دوسرا ماہر آثار قدیمہ مسٹر سٹین۔ جو اکثر مواقع پر مقامات کے محل وقوع میں دوسروں سے اظہار اختلاف کرتا رہا ہے۔ اس میں بھی اپنی جدا رائے ظاہر کرتے ہوئے بازیرہ کو علاقہ سوات میں باری کوٹ کے مقام پر اور اورا کو باری کوٹ سے چند میل دور اوڈے گرام کی جگہ آباد بتایا گیا

ہمارا خیال ہے کہ جن دنوں مذکورہ ماہرین آثار قدیمہ مصروف تحقیقات وتلاش تھے۔ ان دنوں زیر بحث علاقہ میں گھومنے پھرنے اور تفتیش وتجسس کی وہ سہولتیں میسر نہ تھیں جو اس وقت حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں کئی مواقع پر ظن وقیاس سے کام لینا پڑا۔ اور وہ اورا نورا اور بازیرہ کا صحیح محل وقوع بیان نہ کر سکے۔ مسٹر کننگھم تو پھر بھی اصل مقامات کے ارد گرد گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن مسٹر سٹین اس جگہ سے بہت دور نکل گئے کہ جس جگہ مذکورہ مقامات آباد بیان کئے جاتے ہیں۔

علاقہ زیر بحث پر نظر ڈالی جائے تو اورا ہمیں اس وقت بھی علاقہ سدھم اور رزڑ کے درمیان آباد دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کے قریب ہی نوگرام کی قدیم آبادی ہے جسے نورہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ اور نوگرام کی قدامت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کے قریب ہی ایک وسیع حوض بھی موجود ہے اور رانی گٹ کے نام سے ان بلند پتھری ستونوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جو بلند و بالا بہ طرز قدیم استادہ دکھائی دیتے ہیں۔ اور پھر اورہ سے کوئی پندرہ میل دور موضع بازار بازیرہ کی بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہے۔ اور اس مذکورہ فاصلہ کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اورا اور بازیرہ کی دو چھوٹی ریاستیں ایک دوسرے

کے قرب میں تھیں اور ان کے محل وقوع کے تعین میں مسٹر کننگھم اور مسٹر سٹین دونوں سے غلطی ہوئی تھی۔ اورا اور لورہ نام کی دو آبادیاں تھیں۔ البتہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی حکومت ریاست اورہ کہلاتی تھی یا ریاست لورہ۔

اساکینوں سے دوسری جنگ اس کے بعد سکندر اعظم نے کوہ ارنوس کی طرف اقدام کیا جسے عام طور کوہ مہابن خیال کیا جاتا ہے۔ وہاں سے پھر اسے سوات کا رخ کرنا پڑا۔ جہاں وہ ایک دفعہ قبیلہ اساکین سے جنگ لڑ چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ کے لوگ آمادہ بہ اطاعت نہ ہوئے تھے اس وجہ سے دوبارہ اس طرف یلغار ہوئی۔ یہ مقابلہ دائرتا (DYRTA) کے مقام پر ہوا۔ سکندر اعظم کامیاب رہا۔ لیکن اس کے باوجود اس علاقہ کے باشندے اطاعت پر آمادہ نہ کئے جا سکے۔ وہ اپنے وطن کو ہی خیرباد کہہ کر دریائے سندھ کو عبور کرتے ہوئے دریائے جہلم اور چناب کے درمیانی علاقہ میں جو ابھی سارا ABHISARA کہلاتا تھا جا مقیم ہوئے۔

سکندر اعظم اس جنگ سے واپس لوٹ کر اوہنڈ (ہنڈ ضلع مردان) پہنچا۔ جہاں اس نے ٹکسلا کے حکمران امبھی (AMBHI یا OPHIS) کے سفیر یا ایلچی کو باریاب کیا اور پھر جنوری ۳۲۶ قبل مسیح میں عازم ہندوستان ہوا۔

بدھ مت کا عروج وزوال

بدھ مت کا ظہور

ہندوستان میں جنم لے کر چھٹی صدی قبل مسیح میں گوتم بدھ نے ایک جدید مذہب "بدھ مت" کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت ہندو دھرم کی مکمل اجارہ داری برہمنوں کے ہاتھ میں تھی۔ انہی کو قوم وملت کی زندگی یا موت کا با اختیار سمجھا جاتا تھا۔ ان کی زبان کا ہر لفظ قانون اور ان کی ہر حرکت فیصلہ کا حکم رکھتی تھی۔ اس اجارہ داری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انسانوں کے بہت بڑے حصہ کو انہوں نے حقوق انسانی سے محروم کر دیا۔ انہیں شودر اور ملیچھ کا نام دے کر اپنی قوم سے جدا کر دکھایا۔ اور ان سے یہاں تک غیر انسانی سلوک ہوا کہ برہمن ان سے براہ راست بات بھی کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ قاعدہ و قانون بنا دیا گیا۔ کہ بوقت ضرورت اگر کسی برہمن کو اس آبادی کے کسی رکن سے گفتگو کرنا ہی ضروری ہو تو وہ مخاطب کسی دوسرے شخص کو کرے اور اس طرح اپنی آواز شودر یا ملیچھ کے کانوں تک پہنچا دے۔ اگر کسی وقت اتفاقیہ طور پر بھی دید کا

کوئی اشلوک کسی شودر کو سنائی دے تو اس جرم میں سیسا پگلا کر اس کے کان میں ڈال دیا جائے۔ ان حالات میں جب بدھ مت کا ظہور ہوا۔ جس کی تعلیم صاف ستھری، عام فہم اور اپنے اندر توحید کا رنگ لئے ہوئے تھی تو عوام نے اس کی آواز پر لبیک کہا اور جلد ہی ہندوستان کی سرزمین پر اس جدید مذہب کا پھریرا لہرانے لگا تھا۔

سکندر اعظم کے گندھارا سے رخصت ہو جانے کے بعد دریائے سندھ کے مغرب کی طرف یونانیوں کی حکمرانی دکھائی دینے لگی تھی۔ دور دراز علاقوں کے چھوٹے موٹے سرداران قبائل اپنی آزادی کے قیام یا اس کے دوبارہ حصول کی کوشش میں منہمک رہے۔ اسی دوران میں جب ۳۲۳ء قبل مسیح میں سکندر نے فرشتۂ اجل کو لبیک کہا تو اس کے بعد ہی یونانی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوئی۔ ہر صاحب طاقت جرنیل یا گورنر نے اپنی انفرادی آزادی کا اعلان کیا۔ انہی حالات میں سکندر سے کوئی بیس سال بعد اس کے ایک قابل و بہادر جرنیل سلوکس کو دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی فکر ہوئی اس نے سندھ کے مشرق کے علاقہ کو جس پر اس وقت ہندوستان کے موریا خاندان کا مشہور حکمران چندر گپتا قبضہ کر چکا تھا دوبارہ اپنے تسلط میں لے لینا چاہا۔ چنانچہ وہ لشکر لئے روانہ ہوا۔ ادھر چندر گپتا بھی کیل کانٹے سے تیار تھا۔ بالآخر دونوں میں مفاہمت ہو گئی۔ چندر گپتا نے پانچصد ہاتھی بطور نذرانہ پیش کئے تو سلوکس نے نہ صرف یہ کہ دریائے سندھ کے مشرقی علاقہ پر اس کا تسلط برقرار

رہنے دیا بلکہ گندھارا اور وادی کابل کے علاقے بھی اس کے زیر اقتدار کر دیئے۔ ساتھ ہی اس سے اپنی لڑکی کی شادی بھی کر دی[1]

چندر گپتا نے بدھ مت قبول کر لیا اور اپنے وقت کا مشہور ترین حکمراں ثابت ہوا۔ اس نے بدھ مت کی تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا لیکن زیادہ تر توجہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرف ہی رہی اور گندھارا کے علاقہ میں بدھ مت کی کسی خاص سرگرمی کا پتہ نہیں چلتا۔ چندر گپتا کے بعد اس کے بیٹے "بندوسرا" نے ۲۹۷ قبل مسیح سے ۲۷۲ قبل مسیح تک اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کامیاب طریقہ پر حکومت کی۔ اس کا بیشتر وقت بھی ہندوستان میں بدھ مت کی تبلیغ پر خرچ ہوا۔ لیکن سندھ پار گندھارا کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی تھی۔

عہد اشوک اس کے بعد چندر گپتا کے پوتے اور تاریخ ہند کے مشہور ترین بدھ حکمران اشوک کی باری آئی۔ اس نے ۲۷۳ قبل مسیح میں سریر آرائے سلطنت ہو کر اپنے آپ کو بدھ مت کے لئے وقف کر دیا[2]۔ بدھ مت کو حقیقتاً اس کے عہد حکومت میں عروج حاصل ہوا۔ اس نے بدھ بھکشوؤں (علماء) کی کانفرنس طلب

---

[1] اوری انٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری۔ ازبیل۔

[2] اس کی تاج پوشی سریر آرائے سلطنت ہونے کے چار سال بعد ۲۶۹ ق م میں ہوئی۔ (پشاور ڈسٹرکٹ گزیٹر ۱۹۳۱ مقالہ ہارگریوز)



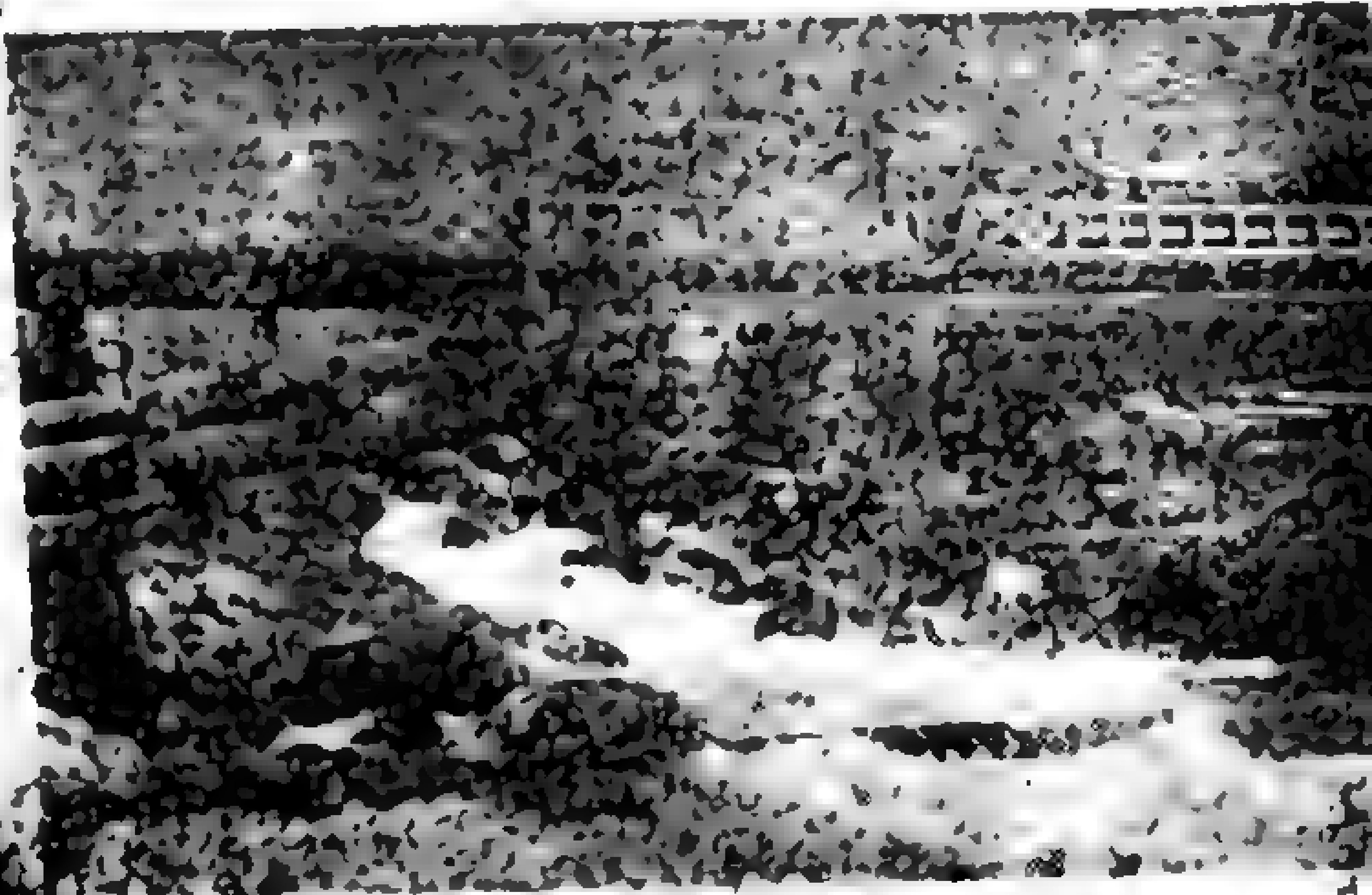
مسجد پیر بابا کا ایک منظر - بونیر



مقبرہ حضرت اخوند درویزہ - پشاور



کوہستان کے باشندے (سوات)



دریائے سوات پر کابلی طرز کا

گئیں۔ مذہبی مسائل کی تشریح و توضیح کرائی گئی۔ مذہبی امور میں جو شکوک یا اختلافات رونما ہو رہے تھے انہیں ختم کر دیا جاتا۔ ملک کے دور دراز مقامات تک مبلغین روانہ کئے۔ یہی نہیں بلکہ بیرون ملک کو بھی بدھ مبلغین اسی دور حکومت میں بھیجے گئے تھے۔ اشوک ہی کے زمانے میں بدھ مت کو گندھارا پہنچنے کا موقع ملا۔ اور اسی عہد حکومت میں مشہور بدھ مبلغ مادھنتیکا (MADHYANTIKA) کو ۲۵۶ سنہ قبل مسیح میں گندھارا اور کشمیر کی طرف بھیجا گیا تھا تاکہ وہ ان علاقوں میں بسنے والوں کو بدھ مت کی تعلیمات سے روشناس کرائے۔ اس طرح گویا عہد اشوک ہی بدھ مت نے گندھارا کے علاقہ میں قدم جما لئے تھے۔ اسی کے دور حکومت میں بدھ مت کو ہندوستان سے نکل کر افغانستان سیلون اور دوسرے دور دراز مقامات تک پہنچنے کا موقع ملا تھا۔ اشوک کے زمانہ میں ملک کے دور دراز علاقوں تک ہی کتبے نصب کئے گئے جن میں علاقہ یوسف زئی کا کتبہ بمقام شاہباز گڑھ بہت ہی مشہور اور قابل ذکر ہے۔ ۲۳۲ سنہ ق م میں ہندوستان اور گندھارا کا یہ مشہور حکمراں دنیا سے چل بسا۔

یوسف زئیوں کی ہجرت

اشوک کے بعد بدھ مت کا زوال شروع ہوا۔ ہندوؤں نے پھر سر اٹھایا۔ یونانی جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ دوبارہ قیام حکومت کے لئے تگ و دو کرنے لگے۔ اس دوران میں وسط ایشیا

کے قبائل نے اس طرف کا رُخ کیا تو قبیلہ ساکا اور کشن وغیرہ گندھارا میں دکھائی دینے لگے۔ اور قبیلہ کشن نے تو کنار گنگا تک جا ڈیرے لگائے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یوسف زئے وسط ایشیا کے تاتاری قبائل کی اطاعت پر آمادہ نہ ہو سکے توان کی یلغار سے تنگ آکر انہوں نے ہجرت کی اور افغانستان و بلوچستان کے درمیانی علاقہ میں مقیم نظر آتے۔ جہاں سے کوئی ایک ہزار سال بعد وہ پھر ملک احمد خان کی قیادت میں موجودہ علاقہ کو واپس لوٹے تھے۔

بدھ مت کے آثار قدیمہ علاقہ سوات کو عہد قدیم میں اس وقت نمایاں ترقی حاصل ہوئی کہ جس وقت بدھ کو عروج حاصل ہوا۔ چینی سیاح ہیون سانگ اس وقت اس علاقہ کا رقبہ پانچہزار (ل) لی ظاہر کرتا ہے۔ جو ہماری پیمائش سے اندازاً ۱۳۳۰ میل کے برابر ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت یہ علاقہ موجودہ سوات کے علاوہ دریائے سندھ کے مغرب کی طرف کی پہاڑیوں اور دارد کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ دوسرے چینی سیاح فاہین کے بیان کی روشنی میں کہ جس نے ۴۰۰ء میں اس ملک کی سیاحت کی تھی اس علاقہ میں بدھ کے پانچصد معبد پجاریوں سے بھرپور نظر آتے ہیں۔ اور پھر ۶۳۰ء میں ہیون سانگ نے بدھ کے دور زوال میں اس علاقہ کو دیکھا تو اس کی چودہ سو خانقاہیں جن میں اٹھارہ ہزار بھکشو رہا کرتے تھے ویران دکھائی دیتی ہیں بقول ہیون سانگ

اس وقت اس علاقہ کے اکثر باشندے مستقلاً جادوگری یا طلسمات کو بطور پیشہ اختیار کر چکے تھے۔ اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ تبت میں مروجہ لاما مذہب کے بانی پدما سنبھاوا (Padma Sambhava) نے بھی اسی علاقہ میں جنم لیا تھا اور تبت کے علاقہ میں جادوگری کے جو کرشمے بیان کئے جاتے ہیں وہ اسی علاقہ کی جادوگری سے متعلق رہے ہوں گے۔

بدھ عہد کے جس قدر کتبے یا آثار قدیمہ اس علاقہ میں ملے یا مل سکتے ہیں اتنے شاید ہی کسی اور علاقہ میں مل سکیں۔ چونکہ اس علاقہ میں کوئی منظم حکومت موجود نہ تھی اس وجہ سے اس طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ عہد انگلشیہ میں جب انگریز لشکر نے اس علاقہ کی طرف یلغار کی اور سرسری طور اس طرف نظر اٹھائی تو اس دوران کشمکش میں سینکڑوں نوادرات انگریز کے ہاتھ لگے جن میں سے کچھ تو ڈھونڈنے والے خود لے گئے اور کچھ پشاور اور لاہور کے عجائب گھروں کی زینت بنے۔ انہی قدیم نوادرات سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقہ میں سانپوں یا اژدھاؤں کی پرستش بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ دریائے سوات کے منبع کے قریب اس مشہور اژدھا کی جائے رہائش بیان کی جاتی ہے جو "اپالالہ" (APALALA) کے نام سے موسوم تھا اور جسے بدھ نے اپنا حلقہ بگوش بنا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے جو بدھ دور کی سنگتراشی میں اس سانپ کو خاص اہمیت سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اور ایک کتبہ سے بھی کہ جو ۱۸۹۵ء میں ملا تھا۔ سانپوں کی پرستش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کتبہ خرد شطی زبان میں ہے۔ اور اس

کی عبارت کا ماہرین نے یوں ترجمہ کیا:

دانی کے بیٹے بھیرا (بدھ بھکشو) لوزا کی ہدایت سے تمام ناگوں کی پرستش کے لئے تالاب بنانے کا فیصلہ ہوا سال ۱۱۳

ماہرین نے اس ۱۱۳ سے ۶۵ سنہ قبل مسیح مراد لی ہے۔

موجودہ حکومت سوات ان آثار قدیمہ کی طرف توجہ دے رہی ہے چنانچہ اٹلی کے ماہرین آثار قدیمہ کی ایک جماعت پروفیسر جی طوسی (G. TUCCI) کی قیادت میں پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ کے تعاون سے کھدائی کا کام کر رہی ہے۔ یہ جماعت ۱۹۵۶ء سے ہر سال چند ماہ سوات میں گزارتی ہے۔ اور جو نوادرات اسے ملے ہیں انہیں سوات کے عجائب گھر میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس جماعت کو کھدائی کے دوران ایسے آثار ملے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پانچویں صدی قبل مسیح سے متعلق ہیں۔ اور بگرام میں ایک محل کے آثار ملے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سکندر اعظم کے حملہ کے وقت موجود اور دربار سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ دوسرے مقام پر کھدائی کرنے سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ علاقہ تیسری صدی کے اواخر یا چوتھی صدی عیسوی میں سیلاب وغیرہ سے برباد ہوا ہوگا۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ پانچویں سے ساتویں صدی کے دوران میں چینی سیاحوں نے جس دارالسلطنت کا ذکر کیا ہے وہ منگورہ کے مقام پر ہی تھا۔ "تت کارا" اس جگہ بیان کیا جاتا تھا جس جگہ چینی سیاح سن ین کی تحریر کے مطابق تالو (TALO) کا

مشہور معبد تھا۔ اس مرکزی معبد کے ارد گرد ایک سو بیس چھوٹے چھوٹے معبد ملے ہیں اور ان میں سے بعض نوادرات بھی دستیاب ہوئے ہیں۔

پروفیسر مذکور کا خیال ہے کہ یہ قدیم مقامات بار بار مٹ کر پھر بنتے رہے اور ان نوادرات کو دیکھتے ہوئے جو ان مقامات سے ملے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ باشندگان سوات نے فن سنگتراشی میں کمال حاصل کر لیا تھا اور اس کمال کی وجہ سے ان لوگوں کو چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں چین بلایا گیا تھا تاکہ وہ وہاں کے معبدوں کو نقش و نگار سے مزین کریں مسٹر طوسی نے اس علاقہ کی شاہراہ کو مشرق و مغرب کے درمیان خاص اہمیت کا متحمل بیان کیا ہے[1]۔

ہندو شاہیہ بدھ مت پر ترقی اور تنزل کے کئی دور گزرے اس مت کی آمد سے برہمن کی اجارہ داری پر کاری ضرب لگی تھی۔ اسی وجہ سے ہندو بدھ کش مکش جاری رہی۔ اور جب کبھی ہندوؤں کو موقع ملا انھوں نے بدھ مت کو ختم کر دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ یہ مخالفت حقیقتاً اشوک کے زمانہ ہی سے شروع ہو چکی تھی اور پہلی صدی قبل مسیح میں مشہور ہندو راجہ بکرما جیت کو اقتدار حاصل ہوا تو اس نے بڑے شدومد سے بدھ مت کی مخالفت کی اسی راجہ کے عہد میں سن بکرمی کا ۵۷ء قبل مسیح میں آغاز ہوا۔ اس کے بعد پھر بدھ مت کو عروج ملا۔ کشن خاندان محافظ بدھ مت نظر آنے لگا۔ پھر بدھ مت کا زوال شروع ہوا۔ ساتویں صدی کے وسط میں ہندوؤں نے بڑے منظم طریقہ پر ہندو دھرم

---

[1] ڈان کراچی ۱۰ دسمبر ۱۹۵۸ء

کی تبلیغ شروع کر دی اور بدھ مت کو مٹا دینے میں کوئی کسر باقی نہ رہنے دی گئی ہن کی آمد کے بعد یعنی اندازاً ۵۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک پھر کسی بیرونی حملہ آور کا پتہ نہیں چلتا۔

ہندوؤں نے مختلف علاقوں میں اپنی راجدھانیاں قائم کر لیں۔ گندھارا کے علاقہ پر وقتاً فوقتاً اقتدار بدلتا رہا کبھی یہ علاقہ کلیتاً آزاد رہا تو کبھی کسی طاقتور حکمران کے زیر اقتدار دکھائی دینے لگا۔ تا آنکہ دسویں صدی میں "ہندو شاہیہ" نے اس علاقہ پر اپنا پرچم لہرایا تو اس کا اقتدار موجودہ صوبہ سرحد سے نکل کر علاقہ سوات اور لغمان (افغانستان) تک دکھائی دینے لگا۔ چنانچہ بریکوٹ (ریاست سوات) سے جو ایک کتبہ دستیاب ہوا اس پر بزبان سنسکرت مرقوم تھا کہ

عہد فرمانروائے اعلیٰ شاہان عظمیٰ کے بلند مرتبہ شاہ اور مختار اعلیٰ سری جیپالا دیوا۔

جیپالا دیوا سے مراد راجہ جے پال ہے حقیقتاً یہی ایک ہندو خاندان تھا جس نے گندھارا پر حکومت کی تھی اس سے قبل کسی وقت بھی کوئی ہندو حکومت اس علاقہ پر حکمران دکھائی نہیں دیتی اور اس آخری ہندو حکومت کا چراغ بھی جلد ہی سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں گل ہو گیا تھا۔

عہد اسلامی کا ابتدائی دور

ابتدائی مسلم حملہ آور سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ہندوشاہیہ کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہوا۔ سلطان نے اس علاقہ پر اپنا پرچم لہرایا۔ اس کے بعد غوری خاندان بر سر اقتدار آیا۔ پھر دوسرے خاندانوں نے جگہ لی۔ اور ہر خاندان نے اپنے وقت میں اپنے اقتدار کے بقا و قیام کے لئے تگ و دو جاری رکھی۔ یہاں اس امر کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ اس وقت تک قبیلہ یوسف زئے موجودہ علاقہ کی بجائے افغانستان اور بلوچستان کے درمیان مقیم تھا۔

یوسف زئیوں کی آمد خاندان مغلیہ کے الغ بیگ کو انہی یوسف زئیوں کی امداد و اعانت سے تخت افغانستان نصیب ہوا تھا۔ لیکن بعد میں چل کر اس کی نیت میں فتور آیا تو اس نے یوسف زئے اور دوسرے افغان قبیلہ گیگیانیوں میں اختلاف پیدا کرا دیا۔

اور خود گیگیانیوں کا ہمنوا ہوکر مقابلہ پر اتر آیا۔ لیکن کامیابی حاصل نہ کر سکا تو چال بازیوں سے کام لینے لگا۔ صلح و صلاحیت کی باتیں شروع کر دیں اور بالآخر یوسف زئی سرداروں کو ایک دعوت میں مدعو کر لیا۔ وہ اعتماد کرتے ہوئے شریک دعوت ہوئے تو اچانک ان پر حملہ کر دیا۔ وہ سنبھل بھی نہ سکے تھے کہ قتل کر دیئے گئے۔ ان حالات میں قبیلہ کے نوجوان ملک احمد خان[1] نے قیادت سنبھالی اور خیر اسی میں دیکھی کہ جس طرح ہو اپنے قبیلہ کو افغانستان سے باہر لے جائے۔ اس میں اگرچہ یہ خطرہ ضرور تھا کہ پھر الغ بیگ آڑے آئے گا۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ ایسی صورت میں خود الغ بیگ کو یہ خطرہ درپیش ہوگا کہ کہیں تمام افغان قبائل مجتمع ہو کر یوسف زئیوں کی حمایت شروع نہ کر دیں۔ چنانچہ اس نے یوسف زئیوں کے افغانستان سے نکل آنے پر کوئی قابل ذکر مخالفت نہ کی۔

ملک احمد خان نے علاقہ پشاور میں داخل ہونے پر وہاں کے مقیم قبیلہ دلازاک سے جائے رہائش کے لئے درخواست کی۔ اور دلازاکوں کے اظہار رضامندگی کر دینے پر یوسف زئیوں کو دوآبہ (پشاور) کے علاقہ میں مقیم کر دیا۔ بعد میں جب دوسرے قبیلے بھی اس طرف کا رخ کرنے لگے تو یوسف زئیوں نے بخوشی خود یہ علاقہ گیگیانیوں کو دیدیا۔ پھر ہشتنگر کا علاقہ محمد زئیوں کے حوالہ کیا اور خود سوات دیر باجوڑ مردان وغیرہ کی طرف چلدیئے جہاں وہ اسوقت تک آباد ہیں

[1] ملک احمد خان ولد سلطان خان قبیلہ مندڑ کے ذیلی قبیلہ رزڑ کی شاخ ملک زئے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی اولاد موضع یار حسین (علاقہ رزڑ) میں آباد ہے۔

علاقہ سوات عہد مغلیہ میں

بابر کا اقدام ادھر پشاور مردان۔ سوات باجوڑ وغیرہ علاقوں میں ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی۔ یوسف زئے اور دوسرے قبائل اپنے لئے جدا جدا علاقے مختص کرتے ہوئے اپنا اقتدار قائم کر رہے تھے۔ ادھر افغانستان میں محمد ظہیر الدین بابر کو تخت کابل پر قبضہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کا ستارہ عروج چمکنے لگا۔ فتح و کامرانی اس کے قدم چومنے لگی۔ ان حالات میں اس نے ہندوستان کا رُخ کرنا چاہا۔ راستہ میں کئی قبائلی آبادیاں اسے اولیں نظر میں کسی طرح باعث مشکلات دکھائی نہ دیں لیکن جب اقدام شروع کرتے ہوئے خیبر پہنچا تو اپنے اندازہ کے برعکس اسے ایسے لوگوں سے

۱؎ پیدائش ۱۵ فروری ۱۴۸۳ء مطابق ۶ محرم الحرام ۸۸۸ھ وفات پیر ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء مطابق ۶ جمادی الاول ۹۳۷ھ۔

واسطہ پڑا جو بہادری اور جوانمردی سے تحفظ وطن کے لئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتے۔ انہوں نے بلا رقومات حاصل کئے بابر کو اپنے علاقہ سے گزرنے کی اجازت نہ دی اور سدراہ ہوئے۔ بابر جیسا حکمران بھی سر تسلیم خم کرنے والا نہ تھا۔ اس نے وقتی طور ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ بدل کر پہلے قبائلیوں سے دو دو ہاتھ کر لینے کا فیصلہ کیا۔

اس سلسلہ میں پہلے پہل اس کی نظر یوسف زئیوں پر پڑی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اس قبیلہ اور الغ بیگ کی کش مکش سے پوری طرح واقف تھا۔ پھر بعض افراد نے الغ بیگ کے قتل میں بھی یوسف زئیوں کا ہاتھ بتایا۔ علاوہ ازیں کہا جاتا ہے کہ ملک احمد خان کی شہرت اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر بابر نے اسے اپنے دربار میں حاضر ہونے کی دعوت دی تھی۔ ملک احمد خان نے اپنے حالات کے پیش نظر دعوت تو قبول کر لی لیکن خود حاضر دربار نہ ہوا بلکہ اپنے ایک عزیز ملک سیفو خان کے فرزند ملک شاہ منصور کو بھیج دیا۔[1] بابر نے اسے خلاف ورزی احکام اور اپنی بے عزتی پر محمول کیا۔ اس کے ساتھ ہی باجوڑ میں اس سے قبل سلطان حیدر علی مرزا الغ بیگ کے احکام کی خلاف ورزی کر چکا تھا۔ اس نے نہ تو اطاعت قبول کی تھی نہ خراج دینے پر رضامند ہوا۔ ان وجوہات سے بابر نے پہلے ہی اس علاقہ کو منتخب کیا اور لشکر لئے روانہ ہو گیا۔

---

[1] ملک شاہ منصور کا تعلق قبیلہ اباخیل (سدوزئے) سے ہے۔

جنگ باجوڑ

مختصر یہ کہ بابر نے اقدام کرتے ہوئے اس علاقہ کو سزا دینی چاہی۔ ۱۵۱۹ء میں یکم محرم الحرام کو باجوڑ کا رخ کیا۔ اس کے ساز و سامان کو دیکھکر بھی سلطان باجوڑ نے جو قبیلہ یوسف زئی سے تعلق نہ رکھتا تھا اور جو یوسف زئیوں سے شکست کھاکر باجوڑ اور افغانستان کے درمیانی علاقہ میں اپنی جدید حکومت قائم کرچکا تھا۔ اطاعت قبول کرنے سے انکار کردیا اور آمادہ بہ جنگ ہوکر مقابلہ پر اتر آیا تو شکست کھائی۔ اس وقت تک باجوڑ کے باشندوں نے بندوق (میچ لاکس[1]) کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اول تو انہوں نے مذاق اڑانا شروع کیا لیکن جب چھ سات آدمی شکار ہوگئے تو انہیں اس کی اہمیت و طاقت کا احساس ہوا۔ اب وہ مختلط ہوکر لڑنے لگے۔ رات گزر گئی۔ دوسرے دن شدت کی جنگ میں میدان بابر کے ہاتھ رہا۔ مزید اقدام کے سلسلہ میں بابر اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ

> چونکہ لشکر کے لئے اناج کی کمی تھی ہم نے وادی کھراج پہنچکر غلہ پر قبضہ کرلیا اور پھر سواد (سوات) میں یوسف زئے افغانوں کے خلاف حملہ کا آغاز کیا۔ دوسرے دن اقدام جاری رکھتے ہوتے ہم نے چندل (جندول) اور دریائے باجوڑ کے مقام اتصال پر ڈیرے جمائے۔ یہاں کے یوسف زئے چند بہت ہی

---

[1] وہ ابتدائی بندوق جس میں اوپر نالی سے بارود بھری جاتی اور چقماق سے پیدا کردہ شعلے سے داغی جاتی تھی۔

دلکش لیکن انتہائی نشہ آور مدہوش کرنے والی کیمال لائے میں نے ایک کے ٹکڑے کاٹے۔ ایک حصہ میں نے خود کھایا دوسرا طاغائی کو دیا اور تیسرا عبداللہ کو۔ اس ایک ٹکڑے نے مجھ پر کافی اثر کیا اور اس قدر مدہوش کر دیا کہ جب نماز مغرب کے بعد بیگ مشوروں کے لئے جمع ہوئے تو میں ان میں شامل نہ ہو سکا اور یہ امر بہت ہی تعجب انگیز تھا کیونکہ اب میں اس قسم کا پورا کیمال معمولی اثر لئے کھا سکتا ہوں۔ حالانکہ اس وقت نصف سے کم نے ہی مدہوش کر دیا تھا۔

میدانی علاقہ میں آمد

اس کے بعد تزک بابری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نامعلوم وجوہات سے اس نے سوات کی طرف مزید اقدام نہ کیا بلکہ دریائے امبار کے راستہ سے میدانی علاقہ یوسف زئی کی راہ لی اور تخت بائی کے گرد و نواح سے گزر کر کاٹلنگ پہنچا۔

بابر کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر علاقہ سوات کی طرف یلغار کرنے کے بعد بلا کسی وجہ ظاہر کئے اس کا واپس میدانی علاقہ کی راہ لینا زیر بحث رہا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ ملک شاہ منصور اس کے دربار میں ایک دفعہ حاضر ہو کر اس سے تعلقات پیدا کر چکا تھا۔ بابر کو اس علاقہ میں پہنچکر غالباً احساس ہوا کہ ایسی حالت میں کہ اس کا مطمح نظر ہندوستان جیسے وسیع مالدار اور زرخیز علاقہ کو فتح کرنا تھا اور ایسی حالت میں کہ خیبر میں آفریدیوں کی روش اور ان کا

استقلال دیکھ چکا تھا۔ اسے یقین ہوا ہوگا کہ اگر یوسف زیئوں سے بھی بگاڑ پیدا کر لیا گیا یا وقتی طور اپنی طاقت کے زور سے اس نے اس قبیلہ کو مطیع بھی کر لیا تو وہ اطاعت حقیقی معنوں میں اطاعت نہ ہوگی اور میدانی علاقہ میں مناسب انتظام کر لئے جانے کے باوجود پہاڑی قبائلی علاقہ کے باشندے پریشان کرتے رہیں گے جس سے افغانستان اور ہندوستان کا درمیانی راستہ کسی وقت بھی محفوظ نہ رہ سکے گا۔

بی بی مبارکہ سے شادی

اس کا واحد حل یہی تھا کہ یوسف زیئوں سے کسی باعزت طریقہ پر تعلقات قائم کر لئے جاتے چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد سے نامہ و پیام ہوتا رہا۔ جس کے نتیجہ میں ملک شاہ منصور نے اپنی دختر نیک اختر بی بی مبارکہ کی شادی بابر سے کر دی۔ جس سے اس قبیلہ کے ساتھ اس کے تعلقات زیادہ بگڑ نہ سکے اور بابر خود لکھتا ہے کہ اس نے یوسف زئی لڑکی سے شادی ہی کو مصالحت کی بہترین شکل خیال کیا تھا۔ بعض مورخین کی رائے میں بی بی مبارکہ بابر کے ہندوستان کی طرف کوچ کر جانے پر باجوڑ کے قلعہ میں مقیم رہی اور اس کے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔

بابر گو یوسف زیئوں پر اپنا اقتدار قائم نہ کر سکا لیکن اس قبیلہ میں شادی کر لینے کے بعد بڑی حد تک اس کے تعلقات ان سے خوشگوار نظر آنے لگے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس کے ہندوستان پر آخری حملہ میں دیگر افغان قبائل کے علاوہ بارہ سو تو صرف یوسف زئے تھے جن کی اکثریت

فتح کے بعد ہندوستان میں ہی مقیم ہو گئی تھی اور انہی کی اولاد نے بعد میں سرزمین ہند پر کئی ریاستوں کی بنیادیں رکھی تھیں۔

بابر کے بعد خاندان مغلیہ کے تمام حکمران یکے بعد دیگرے اپنے اپنے عہد حکومت میں سوات پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پورے علاقہ یوسف زئے پر

قتل و خونریزی اور ملک کی تباہی و بربادی کے باوجود ان (قبائلی) علاقوں میں مغل کسی وقت بھی مستقلاً اپنے پاؤں نہ جما سکے اور نہ ہی کسی وقت ان حقائق کو ضبط تحریر میں لانے کے قابل ہوئے۔ اس وجہ سے آئین اکبری کی کوئی ایک جلد بھی مکمل نہیں کہلا سکتی۔ (میجر راورٹی)

انہی خیالات کو حضرت میاں گل عبدالودود بانئے ریاست سوات جدید نے یوں تصدیق کر دی تھی کہ

تاریخ کے کسی دور میں حتے کہ عہد اکبر یا اورنگ زیب میں بھی اور درانیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اس علاقہ یوسف زئے کے باشندے کسی حکومت کے تابع فرمان نہیں رہے تھے۔[1]

---

[1] دی پٹھان از اولف کیرو

تحریک روشنائی

محمد ظہیر الدین بابر کے بعد مغلوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں کہ ابھی وہ قیام واستحکام کے لئے تگ و دو کر رہے تھے۔ انہیں ہندوستان میں شیر شاہ سوری سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اسی قبیلہ یوسف زئی کا چشم و چراغ اور اپنے مسکن موضع سورئے کی نسبت سے سوری پکارا جاتا تھا۔ اس شیر شاہ نے مغلوں کو ایسا پریشان کیا کہ ہمایوں کے لئے ہندوستان سے نکل بھاگنے کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ رہا۔ اور پھر ایک عرصہ تک مصائب و آلام برداشت کرنے کے بعد اسے بھی دوبارہ تخت دہلی پر متمکن ہونے کا موقع ملا تھا۔

اس ابتدائی عہد ہمایونی میں پٹھانوں کے اندر بایزید نامی ایک شخص نے مذہب کے نام پر ایک قومی تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک نے ابتدا میں

خاطر خواہ کامیابی حاصل کرلی۔ علاقہ یوسف زئے بشمول علاقہ سوات کے باشندے بایزید کے گردیدہ نظر آنے لگے اور اس بانئے تحریک نے اتنی ہر دلعزیزی حاصل کرلی کہ اسے "پیر روشن" پکارا گیا اور تاریخ کے اوراق پر اس کی تحریک نے "تحریک روشنائی" کے نام سے جگہ حاصل کرلی۔

اس تحریک کی مخالفت میں حضرت پیر بابا میدان میں نکل آئے۔ وہ ایک عرصہ سے بونیر میں مقیم رہ کر اپنے زہد و تقوی کی وجہ سے شہرت اور اثر و رسوخ حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے مخالفین کی ایک جماعت پیدا کرلی اور ان کے خلیفہ یا دست راست حضرت اخون درویزہ اس مخالفت کی عملاً مخالفت کرتے نظر آئے۔ حضرت پیر بابا کا تعلق شاہی مغل خاندان سے تھا ان کے والد شاہی خاندان میں شادی کر چکے تھے اور حضرت پیر بابا اسی شہزادی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ہمایوں کے ہندوستان سے شیر شاہ سوری کے ہاتھوں فرار ہونے پر حضرت پیر بابا کے والد بزرگوار سید احمد ترمذی تو ہمایوں کے ہمرکاب رہے۔ لیکن انہوں نے اپنے لڑکے سید علی ترمذی کو جو بعد میں چل کر پیر بابا کے لقب سے مشہور ہوئے تھے ہندوستان میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہندوستان سے نکل کر اول دو آبہ (ضلع پشاور) میں گیگیانیوں کے پاس مقیم رہے اور بعد میں بونیر میں مستقلاً اقامت اختیار کرلی تھی۔ حضرت اخون درویزہ کی نسبت وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس قبیلہ سے متعلق تھے۔ بعض لکھنے والوں نے انہیں تاجک بتایا ہے تو بعض نے مغل۔ بہرحال اس میں اختلاف نہیں کہ وہ قبیلہ یوسف زئے سے نہ تھے۔

بایزید (پیر روشن) کا تعلق قبیلہ اڑمڑ یا انصار سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا خاندان کانی گرام (وزیرستان) سے آمدہ بیان کیا جاتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ تحریک روشنائی کی موافقت اور مخالفت میں خوب رسہ کشی ہوئی۔ اول الذکر نے مذہب کے نام پر اسے اٹھانے اور زندہ رکھنے کی کوشش کی تو موخر الذکر نے مذہب ہی کے نام سے اسے دفن کر دینا چاہا۔ حقیقت یہ ہے کہ میدان علم میں دلائل و براہین سے پیر روشن کو شکست نہ دی جا سکی۔ اس کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ مخالفین کو اپنی بے لبسی کا احساس ہونے لگا۔ چنانچہ پیر روشن کے شدید ترین مخالف حضرت اخون درویزہ لکھتے ہیں کہ

علماء اس کے عقلی استدلال کے سامنے بے بس تھے۔ انہیں عقلی و نقلی دلائل سے اس نے زچ کر دیا تھا۔[1]

اس کا لازمی نتیجہ جنگ و جدل کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مقابلے ہوئے مذہب کے نام پر طرفین کے ہزاروں آدمی کام آئے۔ اس دوران میں پیر روشن نے وفات پائی۔ لیکن تحریک بدستور چلتی رہی۔ مقابلے ہوتے رہے۔ پیر روشن کے مریدین اور اس کے لڑکے اپنے عزم و ارادہ پر قائم رہے۔ تا آنکہ آخری فیصلہ کن جنگ موضع مینی (ضلع مردان) کے قریب لڑی گئی۔ تحریک کی حمایت میں پیر روشن کے مریدین اور اس کے لڑکے ملا میرزا المعروف حسن پیر) کی

---

[1] مجلہ پختو (پشاور یونیورسٹی) جلد ۲ شمارہ ۲۔

قیادت میں نبرد آزما تھے تو مخالفین حضرت ملا اخون درویزہ کی رہنمائی میں مصروف جنگ نظر آئے۔ میدان کارزار مخالفین کے ہاتھ رہا۔ تحریک روشنائی کا قائد ملا میر بھی اس جنگ میں کام آیا۔ اور پیر روشن کے تین لڑکوں کی زندگی کا چراغ بھی گل ہوا۔ چوتھا جلال (جلالہ) جو کم عمر اور بہت خوبصورت تھا گرفتار ہو کر اکبر اعظم کے پیش کیا گیا تھا۔ جسے اکبر نے بڑی عزت و احترام سے اپنے پاس مقیم رکھا۔ لیکن وہ اس زندگی سے مطمئن نہ ہو سکا تو بھاگ نکلا اور پھر ساری عمر اس نے مغلوں کو چین لینے نہ دیا۔ اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ اخون درویزہ کے فتوے یا حکم سے پیر روشن کی لاش کو نذر آتش کرتے ہوئے اس کی اہلیہ کو کسی ڈوم کے حوالہ کر دیا گیا تھا۔

مذکورہ جنگ کے بعد گو یہ تحریک افریدی۔ مہمند۔ بنگش وغیرہ علاقوں میں تو چلتی رہی۔ لیکن علاقہ یوسف زئی بشمول سوات میں اس کا چراغ گل ہو گیا۔ اور وہ بایزید جسے پیر روشن کہا جاتا تھا پھر پیر تاریک پکارا جانے لگا۔ اور ایسا منظم و وسیع پیمانے پر مخالف پراپیگنڈا ہوا کہ عوام اسے مخالف اسلام پیر تاریکی کے نام سے ہی یاد رکھنے لگے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر اس تحریک کی مذہب کے نام پر اس شدت سے مخالفت نہ کی جاتی تو یہ تحریک پٹھانوں کو منظم کر دکھانے میں وہ کارہائے نمایاں کرتی کہ ہندوستان کی تاریخ میں مغلوں کی بجائے پٹھانوں کے حالات سے اوراق مزین کئے جاتے اور صدیوں تک پٹھان حکومت کرتے دکھائی دیتے۔[1]

[1] قدرے تفصیلات کیلئے دیکھو "یوسف زئی" یا "تحریک روشنائی"۔

درانی سکھ اور انگریز

مغلوں کی مرکزی حکومت اپنے آخری دور میں ناقابل بیان حد تک کمزور ہو چکی تھی، درحقیقت برسوں قبل صوبہ سرحد کے علاقہ سے اس کا اقتدار اٹھ چکا تھا۔ افغانستان میں جن لوگوں کو حکومت یا گورنری ملی ان میں اتنی طاقت و سکت نہ تھی کہ قبائلیوں سے نبرد آزما ہو سکتے۔ ایسی حالت میں قبائلی علاقہ کو ایک عرصے کے لئے بیرونی حملہ آوروں سے نجات مل گئی۔ انہی حالات میں جب افغانوں کے مشہور حکمران احمد شاہ ابدالی نے افغانستان میں اپنی حکومت قائم کرلی تو تمام افغان اسے اپنی قومی حکومت خیال کرتے ہوئے اس کی امداد و اعانت کرنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود سوات اور ارد گرد کے پہاڑی علاقوں نے اطاعت پر اظہار آمادگی نہ کیا۔ اگرچہ وہ احمد شاہ ابدالی کی امداد کرتے رہے۔

درانیوں کے بعد سکھوں کی باری آئی۔ انہوں نے اپنی وحشت و بربریت

کو علاقہ یوسف زئے میں پوری طرح بے نقاب کر دکھایا۔ لیکن اقتدار حاصل نہ کر سکے۔ ان کی جانشینی کا فخر انگریزوں کو حاصل ہوا۔ تو ظلم و ستم اور جبر و استبداد میں وہ کسی طرح سکھوں سے کم نہ تھے۔ ان کے پاس طاقت تھی۔ کارکن تھے۔ مال و دولت تھی۔ قیام حکومت کا جذبہ تھا۔ پشت پر انگلستان کی منظم و وسیع حکومت تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ میدانی علاقوں میں تو اپنا اقتدار قائم کر لینے میں کامیاب رہے۔ لیکن قبائلی علاقہ بدستور آزاد رہا۔ اور صوبہ سرحد میں پورے ایک سو سال تک مقیم رہنے کے باوجود علاقہ سوات کو زیر نگیں نہ کیا جا سکا۔ جس پر اس علاقہ کے باشندے جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔

ملا مستان کا ظہور انگریز اگرچہ علاقہ سوات پر قبضہ نہ کر سکا تھا۔ تاہم علاقہ مالاکنڈ اور پائیں سوات میں اس کے سیاسی اقتدار کو باشندگان وطن برداشت نہ کر سکے۔ اور اندر ہی اندر آگ سلگنا شروع ہوئی۔ حتیٰ کہ مئی ۱۸۹۷ء میں انگریزوں کو ایسی اطلاعیں بھی ملیں کہ جن سے بالائی سوات کے باشندوں کی مخالفت یا ان کے ابھرتے ہوئے جذبات کا پتہ چل سکتا تھا۔ لیکن انگریز نے نشہ اقتدار میں ان اطلاعوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا تا آنکہ خود نواب دیر نے انگریزوں کو پالم ملا صاحب اور ان کے رفقاء کی سرگرمیوں کی طرف متوجہ کیا۔ گو اس وقت یہ تحریک زیادہ تر کامیاب نہ رہی تاہم اس نے عوام کے جذبات ابھارنے میں کافی امداد دی تھی۔

۱۸ جولائی ۱۸۹۷ء کو لنڈاکئے کے قریب ملامستان کے نام سے ایک مرد مجاہد نمودار ہوا۔ اس ملامستان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بونیر کے ایک معزز خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ والدین نے سعداللہ خان نام رکھا۔ شوق حصول علم اسے مختلف ملکوں کی سیر کراتا رہا۔ ایک عرصہ تک اجمیر شریف میں بھی قیام کیا۔ وہ ابتدا ہی سے بہادر، نڈر۔ اور طاقت و توانائی میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں جب اجمیر شریف سے واپس لوٹا تو اپنے جذبۂ جہاد اور جذبات علیہ کے اظہار کی وجہ سے "ملامستان" اور سرطور فقیر (برہنہ سر) پکارا گیا[1]۔

انگریز کو ملامستان کی آمد اور عوام کو دعوت جہاد دینے کا علم ہوا تو اس نے مردان سے گائڈس نامی فوج طلب کرلی اور فیصلہ کیا کہ راتوں رات "امان درہ" پر قبضہ کرلیا جائے۔ اسی دوران میں ۲۶ جولائی کو ملا نے لنڈاکئے سے تھانے کا رخ کیا۔ خود انگریز مصنفین کے خیال میں اس وقت اس کے ساتھ صرف چند خورد سال لڑکے ہاتھوں میں جھنڈیاں اٹھائے چل رہے تھے۔ لیکن راستہ میں تین چار سو یوسفزئی ساتھ ہو گئے تو الہ ڈھنڈ۔ بٹ خیلہ۔ اور پیر کوردنہ سے ہوتے ہوئے اس نے مالاکنڈ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ پولیٹیکل آفیسر (میجر ڈین) اپنے لشکر کو پہلے ہی تیاری

---

[1] غالباً اس لفظ مستان کی مناسبت سے انگریزوں نے میڈ ملا (MAD MULLA) (مستانہ ملا) کے نام سے اس کا ذکر کیا۔

کا حکم دے چکا تھا کہ وہ دن نکلتے ہی ملامستان کے لشکر کو آنے کے ساتھ ہی منتشر کر دے۔ لیکن اس لشکر نے رات کوئی نو بجے کے قریب اچانک مالاکنڈ پر حملہ کر دیا۔ جس کا وہاں کے لشکر کو وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ انگریز لشکر ہی سراسیمگی کی حالت میں ہتھیار سنبھالنے لگے۔ انگریز نے سکھوں کو آگے جھونکا ان میں کے اکثر قتل ہوئے۔ شدید دست بدست جنگ ہوتی رہی طرفین کی لاشیں تڑپتی نظر آنے لگیں۔ قبائلیوں نے کوارٹر گارد پر قبضہ کرتے ہوئے تمام اسلحہ و بارود لوٹ لیا اور صبح تک یہ ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔[1]

اسی رات قبائلیوں نے چکدرہ پر بھی حملہ کر دیا۔ وہاں بھی سخت مقابلہ ہوا۔ ۲۷ جولائی کو لندن اور شملہ میں بیٹھے ہوئے حکمرانوں کو اطلاع ملی تو انہوں نے تازہ دم لشکر روانہ کرنے کی ہدایات جاری کر دیں چنانچہ ۳۰ جولائی سنہ ۱۸۹۷ء کو ذیل کا سرکاری اعلان مشتہر ہوا۔

> گورنر جنرل ان کونسل لشکر کی روانگی کی اجازت مرحمت فرماتی ہیں جو مالاکنڈ فیلڈ فورس کہلائیگا۔ اس کا مقصد مالاکنڈ اور ملحقہ چوکیوں پر قبضہ رکھنا ہے اور ساتھ ہی گرد و نواح کے قبائل کے خلاف وقت ضرورت ضروری کارروائی کرنا ہے[2]

---

[1] ایک انگریز مصنف کے قول کے مطابق صبح ۱۹ قبائلیوں کی لاشیں ملیں ایک کرنل ایک میجر اور ایک لفٹننٹ قتل ہوئے ایک میجر ایک کپتان اور لفٹننٹ زخمی ہوئے سپاہیوں میں ۲۱ مارے گئے اور ۳۱ زخمی ہوئے۔ [2] مالاکنڈ فیلڈ فورس۔ چرچل۔

انگریز لشکر کا اقدام

۳۱ جولائی ۱۸۹۷ء کو مذکورہ لشکر کا نوشہرہ چھاؤنی (ضلع پشاور) میں اجتماع ہوا۔ جنرل بنڈن بلڈ نے اس کی قیادت سنبھالی۔ اس رات قبائلیوں نے چکدرہ پر پھر حملہ کرتے ہوئے دو انگریز افسر ۱۶ سپاہی اور ۲۶ گھوڑے مار دیئے۔ یکم اگست کو قبائلیوں نے ایک بار پھر حملہ کرتے ہوئے چکدرہ کی چوکی پر قبضہ کر لیا۔ ۲ اگست کو انگریز کے مذکورہ لشکر نے موقع پر پہنچکر پھر اس علاقہ میں اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی۔ قبائلیوں سے مقابلہ ہوا وہ ڈٹ کر مقابلہ پر اترے لیکن اس تازہ دم لشکر کے سامنے ٹھہر نہ سکے تو پیچھے ہٹ گئے۔ انگریز رسالہ نے اقدام کرتے ہوئے امان درہ پر قبضہ کرتے ہوئے چکدرہ کو بھی محاصرہ میں لے لیا اور جو قبائلی انگریز کے ہاتھ لگا اس کی کوئی بات سنی نہ گئی۔ اسے یا تو نیزوں سے چھلنی کیا گیا یا فوراً قتل کر دیا جاتا رہا۔ سکھوں کو حکم ملا کہ وہ اپنے انتقام میں بٹ خیلہ پر یورش کریں جو امان درہ کے قریب ہی واقع ہے۔ وہاں بھی مقابلہ ہوا کئی لشکری مارے گئے اور آٹھ قبائلیوں کو سکھوں نے اپنی سنگینوں سے چھلنی کر دیا۔ ان جنگوں میں باشندگان سوات باجوڑ اور اتمان خیلوں کے علاوہ بڑی تعداد میں مقبوضہ علاقہ کے لوگوں نے بھی شمولیت کی اور اپنے قبائلی بھائیوں کی امداد و اعانت کے لئے دادی بائے زئے (ضلع مردان اور تنگی (ضلع پشاور) کے جتھے خاص طور قابل ذکر ہیں۔

اب اس انگریز لشکر نے جوش انتقام میں اردگرد کے علاقہ کو تاراج

کرنا شروع کیا۔ اسے چھوٹے چھوٹے دیہات میں مختصر سی آبادیوں کے خلاف اپنی طاقت آزمانے کا موقع ملا اور گو اکثر آبادیاں گھروں کو خالی چھوڑ کر پیچھے پہاڑیوں میں جا مقیم ہوئی تھیں تاہم بہادری کا سکہ جمانے کے لئے ان کے مکانوں کو مسمار کرنے میں ہی انگریز کو اپنی بہادری کے جوہر نظر آنے لگے۔ اور اس طرح پائیں سوات کے علاقہ کو روندا جا چکا تو بالائی سوات کی طرف نظر اٹھی۔ اب کسی کے گناہگار یا بے گناہ ہونے کا کوئی سوال در پیش نہ تھا قبائیلیوں کو کچلنا۔ انہیں اپنی اطاعت پر مجبور کرنا اور اپنی طاقت کا رعب جمانا مقصود تھا۔ بالائی سوات کے باشندے اس وقت جنگ کرنا نہ چاہتے تھے اس وجہ سے انہوں نے شرائط صلح طلب کر لیں لیکن فیصلہ یہی ہوا کہ اس علاقہ کو بھی روند کر اپنا اقتدار قائم کیا جائے۔ اپنی طاقت کا رعب بٹھایا جائے۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش کر دیا گیا کہ جو قوم صدیوں سے ایسے حالات کا مقابلہ کر چکی تھی اسے کیسے اطاعت پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ وقتی طور وہ ضرور دب سکتی تھی لیکن آگ کی چنگاری بھی آگ ہی ہوتی ہے کے مصداق کسی وقت وہی چنگاری مخالفین کے پورے نظم و نسق کو جلا کر خاک بھی کر سکتی تھی۔

بالائی سوات پر حملہ چنانچہ درخواست صلح یا طلبی شرائط صلح کے مسئلہ کو در خور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے انگریز نے اقدام کا فیصلہ کیا تو ۱۶ اگست کو لشکر تھانہ کی طرف روانہ ہوا اور اس مہم کو اتنا اہم خیال کیا گیا کہ جنرل بلڈ کے کثیر لشکر کی امداد کے لئے ایک دوسری

لشکر کو رستم (مردان) میں مقیم کر دیا گیا تاکہ باشندگان بونیر اس لشکر کے خوف سے سواتیوں کی امداد نہ کر سکیں۔ مختصر یہ کہ لشکر نے اقدام کرتے ہوئے اس دن یعنی ۱۶ اگست کو موضع لنڈاکئے پر حملہ کر دیا باشندوں کو انگریز کے ارادوں کا قبل از وقت علم ہو چکا تھا۔ گو تعداد میں کم تھے تاہم مردانہ وار مقابلے کے لئے نکلے تو انگریز لشکر کا منہ پھیر دیا۔ جنرل بلڈ نے اسے اپنی ذلت پر محمول کیا ہوگا۔ چنانچہ دوسرے دن ۱۷ اگست کو تازہ دم لشکر بڑے ہی نظام سے توپ خانہ ساتھ لئے آگے بڑھنے لگا جیسے کسی بڑی اور منظم حکومت سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ قبائلیوں نے جلالہ کے قریب اس لشکر کو روک کر مقابلہ شروع کیا۔ توپخانہ کی آتش باری کی تاب نہ لاکر قبائلی پیچھے ہٹنا شروع ہوئے تو انگریز کو ان کے پسپا ہو جانے کے خیال نے تعاقب پر مجبور کیا قبائلیوں نے یہ حالت دیکھی تو مڑ کر شدت سے حملہ کر دیا شاہی لشکر کے بہت سے آدمی کام آئے اور طرفین لڑتے جھگڑتے پھر لنڈاکئے تک جا پہنچے یہاں سے انگریز لشکر پھر واپس ہو کر اپنے کیمپ کو لوٹ گیا۔[1]

---

[1] گائیڈ نامی فوج کے طعام خانہ (مس) بمقام مردان ایک رنگدار تصویر آویزاں ہے۔ جس میں لنڈاکئے کے مقام پر لفٹننٹ گریوز کے مردے کو غازیوں کے ہاتھوں سے چھیننے کا نقشہ دکھایا گیا ہے اسی جنگ میں انگریز کو دو ڈھول بھی ہاتھ آئے وہ اس جگہ بطور یادگار رکھے ہوئے ہیں۔

جدید انتظامات اور ساز و سامان کے ساتھ ۱۸ اگست کو پھر اقدام شروع ہوا قدم قدم پر قبائلی مدافعت کرتے رہے تاآنکہ ۱۹ اگست کو اس لشکر نے منگورہ میں جادم لیا۔ قبائلی حسب معمول سایہ کی طرح ساتھ رہے۔ انہوں نے انگریز کو دم نہ لینے دیا۔ اس کے آگے راستہ کی مشکلات اور قبائلیوں کے عزم کو دیکھتے ہوئے انگریز نے ۲۱ اگست کو واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کیا تو ۲۴ اگست کو بری کوٹ میں قیام کے بعد اپنے کمپ کی راہ لی۔ سوات کی طرف انگریز کا یہ آخری بڑا حملہ تھا۔


سوات
کا
دورِ جدید

سوات کا دورِ جدید

زمانہ قدیم سے درانیوں کے عہد پھر انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں
صدی کے ابتدائی سالوں میں علاقہ سوات پہ جو کچھ گزرتی رہی اس کا ذکر
گذشتہ اوراق میں اپنے مناسب مقامات پہ کیا جاچکا ہے۔ اس وقت
جدید ریاست کے مختصر حالات جو مذکورہ ادوار کے لیے وقوع پذیر
ہوتے لکھے جاتے ہیں جن کی ابتداء ۱۹۱۷ء میں میاں گل عبدالودود
کے بادشاہ منتخب ہونے پر ہوئی تھی۔ ان حالات کو سمجھنے کے لئے ضروری
معلوم ہوتا ہے کہ اس پس منظر پر بھی قدرے روشنی ڈالی جائے کہ جو
میاں گل عبدالودود کے اس ریاست کو جدید زندگی دلانے کا باعث بنا۔

حضرت اخوند صاحب بانئے سوات حضرت میاں گل عبدالودود کے دادا حضرت اخوند صاحب سوات کا۔

سلسلہ نسب مہمندوں کے قبیلہ صافی سے جاملتا ہے۔ آپ علاقہ شامیزئے (سوات) کے موضع جبڑی میں بہ دوران سال ۱۷۹۴ء پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام عبدالغفور اور والد کا عبدالواحد تھا۔ بچپن ہی سے حصول علم کا شوق اور زہد و تقویٰ سے رغبت رہی۔ اسی کا نتیجہ تھا جو بعد میں چل کر اخوند پکارے گئے اور دنیا انہیں حضرت اخوند صاحب سوات۔ صاحب سوات اور بابائے بیدو شریف کے باعزت ناموں سے اس وقت تک یاد کئے جارہی ہے۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج طے کرنے کے بعد آپ گھر سے نکل کر گجر گڑھی (ضلع مردان) میں اس وقت کے مشہور عالم دین مولانا عبدالحکیم سے حصول تعلیم کرتے رہے، کچھ عرصہ آپ نے چمکنی (پشاور) اور زیارت کاکا صاحب (تحصیل نوشہرہ) گزارا۔ پھر پشاور شہر میں حضرت جی صاحب[1] کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اور آخر میں موضع طور ڈھیر (ضلع مردان) میں کچھ عرصہ مولانا محمد شعیب کی خدمت میں گزارنے کے بعد ان کی وفات پر ۱۸۱۶ء میں آپ نے دریائے سندھ کے کنارے موضع بیکی میں جا قیام کیا۔ اور وہیں مشغول عبادت رہے۔ اندازاً ۱۸۲۸ء میں بیکی سے نکل کر نمل اور پھر وہاں سے موضع سلیم خان پہنچے۔ جہاں انہیں اول بار اخوند پکارے جانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ سکھوں اور درانیوں کی جنگ میں آپ نے دوست محمد خان فرمانروائے افغانستان کا ساتھ دیا۔ اس طرح اپنی عمر کے چوبیس سال گزارنے کے بعد ستمبر ۱۸۳۵ء میں وہ اپنے وطن کو واپس لوٹ گئے۔ ابتداً انہوں نے موضع ملوچ کی ایک مسجد میں قیام کیا۔ وہاں

---

[1] آپ کا مزار محلہ صاحبزادہ فضل حق (چڑیکوبان) پشاور میں ہے۔

سے موضع رنگیلا کو منتقل ہوئے پھر موضع ہوڈی گرام کے قریب غازی بابا کے مزار میں قیام رہا اور بعدازاں مرغزار کے پرفضاء مقام کی راہ لی۔ وہاں سے موضع سپین باندی میں جاکر شادی کی اور ۱۸۴۵ء میں اس جگہ سے نکل کر موضع سیدو میں سکونت اختیار کرلی۔ جو اس وقت ان کے تقدس کی وجہ سے سیدو شریف کہلاتا ہے۔ اور ریاست سوات کا دارالسلطنت ہے

سوات کی پہلی حکومت

سیدو میں مقیم ہو جانے کے بعد آپ نے باشندگان وطن کی فلاح وبہبود کی طرف توجہ دی۔ ۱۸۴۹ء میں انگریز کے علاقہ سرحد میں پہنچ جانے پر آپ نے مستقبل کے خطرات کا اندازہ لگاتے ہوئے اس علاقہ کو منظم کرنے کے لئے تگ ودو شروع کی تو اپنے زہد وتقویٰ کی وجہ سے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ آپ نے مختلف علاقوں کے خوانین اور رؤساء کو دعوت مشاورت دے کر ان کے سامنے ملت کی تنظیم کا اہم ترین مسئلہ پیش کیا واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے۔ مستقبل کے خطرات سے آگاہ کیا اور تجویز کی کہ تمام باثر افراد اپنی انفرادیت کو چھوڑ کر کسی ایک شخص کو اپنا امیر منتخب کرلیں۔ اور اس طرح متحد و متفق ہو کر تحفظ ملت کا انتظام کریں سب نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا تو عام خیال یہی تھا کہ وہ خود امیر منتخب ہوں گے۔ لیکن وہ اس بارگراں کو اٹھانے کے لئے تیار نہ تھے عوام نے اصرار کیا تو آپ نے حضرت پیر بابا کی اولاد سے سید اکبر شاہ کو امارت

۱؎ حضرت پیر بابا کا ذکر عہد مغلیہ میں دیکھئے۔

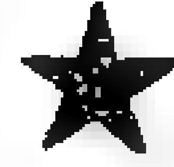
کے لئے پیش کرتے ہوئے خود اس کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ حاضرین نے یہ حالت دیکھی تو انہوں نے سید اکبر شاہ کو اپنا امیر یا بادشاہ تسلیم کرلیا۔ ایک ریاست کی بنیاد پڑ گئی تو موضع غالیگی اس کا دار السلطنت قرار پایا۔ شریعت اسلامیہ کے نام سے اس امارت نے کام شروع کیا لیکن کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی۔ چھ سات سال کے عرصہ میں ہی اس کی بنیادیں متزلزل نظر آنے لگیں۔ اس دوران ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا آغاز ہوا۔ ملت کو منظم کرنے کا یہ عظیم موقعہ تھا لیکن عین اس وقت جب کہ مذکورہ جنگ کی خبریں سرزمین سرحد پر پہنچنے لگی تھیں۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو سید مبارک شاہ فرشتہ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ نظام میں پہلے ہی ابتری پھیل چکی تھی اب ان کے انتقال سے اس اولین امارت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ انگریزوں کو جو اس مذکورہ امارت سے خطرہ پیدا ہو رہا تھا اس کا اندازہ سر ہربرٹ ایڈورڈ کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جن میں لکھا ہے کہ

> اگر سوات میں شرعی حکومت اور جنگجو قبائل کا سربراہ
> سید اکبر شاہ زندہ ہوتا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

سید اکبر شاہ کے بعد

سید اکبر شاہ کی وفات پر ملک بھر میں پھر کوئی نظام دکھائی نہ دیا۔ خود اخوند صاحب اس بار امانت کو اٹھانے کے لئے تیار نہ تھے اور دوسری ایسی کوئی شخصیت دکھائی نہ دیتی تھی جن کے کندھوں پر اس امانت کو ڈال دیا جاتا۔ ان حالات میں سید اکبر شاہ کے فرزند سید مبارک شاہ اور حضرت اخوند کے









ے ریاست سوات کے خلف اصغر

شہزادہ [illegible]

میاں گل عبد الودود

بانئ ریاست سوات





فرزند میاں گل عبدالخالق دونوں نے حصول اقتدار کی کوشش کی۔ اخوند کی موجودگی میں ان کی تائید حاصل کئے بغیر کسی کو برسراقتدار آنے کا موقع نہ تھا اور ان دونوں کو ان کی حمایت حاصل نہ تھی۔ اس طرح کوئی حکومت قائم نہ ہوسکی۔ البتہ حضرت اخوند از خود اتحاد و تنظیم کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے مذہبی فتووں اور فیصلوں کو عزت و احترام سے دیکھا جاتا رہا۔ اس دوران میں صوبہ سرحد کی مشہور جنگ امبیلہ کا آغاز ہوا[1] تو ضرورت وقت کے پیش نظر قبائل کی درخواست پر آپ نے اس جنگ میں شرکت کی۔ بڑی تعداد میں آپ کے مریدین ہم رکاب تھے۔ اس کے بعد کوئی قابل ذکر واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا۔ آپ نے ۱۲ جنوری ۱۸۷۷ء مطابق ۷ محرم الحرام ۱۲۹۵ھ بروز شنبہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ تو سیدو شریف میں ہی آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔ جہاں آپ کا عالی شان خوبصورت مقبرہ اس وقت تک عوام و خواص کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور جہاں دور دراز علاقوں سے آنے والے ہزاروں زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

[1] یوسف زئے از یوسفی۔

شجرۂ نسب

حضرت اخوند صاحب کی اولاد کا شجرۂ نسب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عبدالواحد

عبدالغفور (حضرت اخوند صاحب سوات)

میاں گل عبدالحنان — میاں گل عبدالخالق

میاں گل عبدالحنان: عبدالرزاق سید بادشاہ — عبدالواحد امیر بادشاہ

میاں گل عبدالخالق: میاں گل عبدالودود بانئے ریاست سوات — میاں گل عبدالمنان (شہزادہ شیریں جان)

میاں گل عبدالودود: میاں گل عبدالحق جہاں زیب خان والئے ریاست سوات — شہزادہ فضل محمود (سلطان روم)

میاں گل عبدالحق جہاں زیب خان: اورنگزیب خان ولیعہد — عالم زیب خان — امیر زیب خان — احمد زیب خان

عالم زیب خان: اکبر زیب خان — اسلم زیب خان — انور زیب خان

حضرت اخوند کے بعد

حضرت اخوند کی وفات کے موقع پران کے دونوں لڑکے عبدالمنان اور عبدالخالق ایک جنگ کے سلسلہ میں نواب دیر کے ساتھ موضع تالاش میں مقیم تھے۔ خبر وفات ملنے پر عبدالمنان واپس لوٹ آئے لیکن عبدالخالق کو بروقت اطلاع نہ مل سکی۔ جلدی میں وہاں سے نکل کر اول الذکر نے حصول اقتدار کی کوشش کی تو یہ اقتدار بہ رنگ حکمرانی مل نہ سکا تاہم اس نے اپنے گرد طاقت جمع کرلی اور ایک قائد یا سردار کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگا۔ برخلاف ازیں موخر الذکر نے اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر عوام کے دلوں پر قبضہ کرلیا۔ علاقہ بھر میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے سلسلہ میں دورے شروع کئے۔ بڑی تعداد میں مریدین اور شیوخ ان کے گرد جمع تھے۔ اس طرح علاقہ میں انہیں مذہبی اقتدار حاصل ہوگیا اور اتنی طاقت میسر آگئی کہ وہ اپنے فیصلوں کو بزور بازو نافذ کرا سکیں۔ حضرت اخوند کی وفات کے کوئی دس سال بعد ان کے بڑے لڑکے عبدالمنان وفات پا گئے۔ ۱۸۹۲ء میں بہ عمر پینتیس سال عبدالخالق بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو ایک دفعہ پھر یہ علاقہ اپنی سابقہ روایات کو زندہ کرنے لگا پھر "گھر گھر خانی" کا دور عود کر آیا اور پھر ملک میں کوئی قیادت باقی دکھائی نہ دی۔

میاں گل عبدالودود کی ابتداء

میاں گل عبدالخالق کی وفات پر

ان کے دو کم سن بیٹے رہ گئے تھے بڑے میاں گل عبدالودود کی عمر کوئی دس سال تھی تو چھوٹے میاں گل شیریں جان بہت ہی کم عمر تھے۔ انہی دونوں کو باپ کا جانشین تسلیم کرلیا گیا۔ وہ سجادہ نشین کی حیثیت سے دکھائی دینے لگے۔ اس طرح گویا بچپن ہی سے مذہبی اقتدار حاصل ہوگیا۔ ایک عرصہ تک تو یہ سجادہ نشین اور ان کے چچازاد بھائی آپس میں اتحاد و اتفاق سے رہے پھر اختلافات نے سر اٹھایا تو طرفین خطرہ محسوس کرنے لگے۔ دونوں نے اپنی اپنی جماعتیں منظم کرنا شروع کیں کشمکش بڑھنے لگی۔ سازشیں شروع ہوئیں۔ نتیجہ یہ کہ حالات اتنے بگڑے کہ ۱۹۰۴ء میں ایک دن جب اچانک یہ دونوں چچازاد بھائی راستہ میں ایک دوسرے کے سامنے آئے تو دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کے اسلحہ نے حرکت کی۔ سید بادشاہ کے گولی لگی تو وہ جانبر نہ ہوسکا دو سال گزرنے کے بعد اس کا دوسرا بھائی بھی اسی طرح میاں گل عبدالودود کی گولی کا نشانہ بنا۔ تو چچازاد بھائیوں کی اس باہمی کشمکش کا خاتمہ ہوا۔

اب دونوں بھائی آپس میں اتحاد و اتفاق سے زندگی بسر کرنے لگے۔ انہوں نے جائداد تقسیم کرلی۔ اس دوران میں میاں گل عبدالودود فریضہ حج ادا کرنے چلے گئے۔ واپسی پر ان دونوں بھائیوں میں بھی اختلاف پیدا ہوا۔ جنگ و جدل تک نوبت جا پہنچی۔ شیریں جان نے سید پر حملہ کردیا لیکن شکست کھائی۔ پھر میاں گل نے کالیگی پر حملہ کرتے ہوئے اس پر قبضہ کرلیا۔ بعد ازاں دونوں بھائی چھ ماہ تک قنبر کے مقام پر ایک

دوسرے کے خلاف صف آرا رہے۔ بالآخر عارضی صلح ہوگئی تو شیریں جان نے تختہ بندؔ میں قیام شروع کیا۔

سوات پر نواب دیر کا حملہ

اس دوران میں سوات میں مقیم دو قبیلوں نِکی خیل اور شموزئے میں اختلافات نے جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ کمزور پارٹی نے نواب دیر سے امداد طلب کی۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لشکر روانہ کر دیا۔ کمزور پارٹی نے دوبارہ اس علاقہ کو فتح کر لیا جو فریق مخالف اس سے چھین چکا تھا۔ لیکن بعد میں جب نواب دیر سے لشکر واپس بلانے کو کہا گیا تو اس نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ جس کا مقصد یہی تھا کہ وہ اب اس علاقہ کو ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا۔ بلکہ اس کے لشکر نے کبل اور نل نامی دو مقامات پر قلعے بھی تعمیر کر لئے۔ اس طرح ۱۹۰۸ء میں نواب دیر نکی خیل اور شموزئے کے علاقہ پر قابض ہو گیا۔

اب باشندوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ سمجھ گئے کہ حقیقتؔ زنجیر غلامی کو انھوں نے خود دعوت دے کر حاصل کیا تھا کچھ عرصہ گزرنے کے بعد " سنڈاکے ملا" نامی ایک شخص کو جو انگریز کے خلاف قبائل میں مصروف عمل تھا اس طرف متوجہ کیا گیا تو وہ سواتیوں کی امداد پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے گرد معتقدین جمع ہو چکے تھے۔ اس نے اقدام شروع کر دیا اور جلد ہی سواتیوں نے نل پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت دیر پر نواب اورنگ زیب خان حکمران تھا اس نے تازہ دم لشکر روانہ کر دیا

جنگ شروع ہوئی۔ سواتیوں نے تنگولی اور بانڈی پر یکے بعد دیگرے لشکر کو شکست دی اور پھر سمبٹ سے اقدام کرتے ہوئے کبل کے قلعے کو بھی مخالفین سے خالی کرالیا۔ اس طرح مذکورہ علاقہ پر دیر کی سیادت باقی نہ رہی۔

سید عبدالجبار شاہ کی حکومت

مندرجہ بالا واقعات نے باشندگان سوات کی آنکھیں کھول دیں انہیں اب اپنی تنظیم کی فکر ہوئی وہ سمجھ گئے کہ نواب دیر پھر کسی وقت حملہ کر کے انہیں غلام بنا لے گا۔ انہوں نے حضرت اخوند کے خاندانی وقار کے پیش نظر میاں گل عبدالودود اور شیریں جان کو حکومت مرتب کرنے کی دعوت دی۔ لیکن ایسی حالت میں کہ دونوں میں اختلافات موجود تھے۔ جنگیں لڑی جا چکی تھیں۔ میاں گل نے ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ حضرت پیر بابا کی اولاد سے سید عبدالجبار شاہ ساکن ستھانہ کو دعوت دے کر بادشاہ بنا دیا جائے چنانچہ ۱۹۱۴ء میں دریائے سوات کے پار شمالی علاقہ میں اس جدید حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

اب دونوں بھائیوں نے جو ایک دوسرے سجادہ نشین کو برسر اقتدار دیکھا تو اپنا خاندانی وقار خطرے میں دکھائی دینے لگا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں بھائی متحد ہو گئے۔ سابقہ دشمنی یا مخالفت کو فراموش کر دیا گیا۔ عبدالجبار شاہ نے یہ حالت دیکھی تو مقابلہ پر اتر آیا۔ کاٹلی اور ہوڈی گرام میں شدید جنگ

لڑی گئی تو یہ دونوں بھائی اپنے آبائی مسکن سیدو کو چھوڑ کر دبار میں جا مقیم ہوئے۔ یہاں موسیٰ خیل۔ بریکوٹ۔ کوٹہ ابوہا وغیرہ کے معززین نے امداد دینے کے وعدے کرتے ہوئے ان دونوں بھائیوں کو سید عبدالجبار شاہ کے خلاف جنگ کرنے پر رضامند کر لیا۔ لنڈاکئے کے قریب معمولی سی جنگ ہوئی وعدہ کرنے والے الیفائے عہد نہ کر سکے تو یہ دونوں بھائی دلبار کی طرف لوٹ گئے۔

اس دوران میں دونوں بھائیوں کو موقع ملا تو وہ بھی نواب دیر کے لشکر میں شامل ہو کر دوسرے ہی دن علاقہ شاموزئے میں داخل ہو گئے۔ اور میاں گل لشکر کی قیادت کرتے ہوئے سیدو تک جا پہنچا۔ عبدالجبار شاہ بھی لشکر لئے پہنچ چکا تھا۔ دونوں میں جنگ ہوئی تو عبدالجبار شاہ شکست کھا کر نیچی گرام میں جا مقیم ہوا۔ ادھر نواب دیر نے علاقہ شموزئے پر قبضہ کر لیا۔ اب نواب اور میاں گل کے لشکر نے متحد ہو کر عبدالجبار شاہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور تندو ڈاک کے مقام پر مورچے لگا دیئے۔ لیکن ماہ رمضان شریف کے شروع ہو جانے کی وجہ سے عارضی صلح ہو گئی۔ اس عارضی صلح کے دوران میں سواتیوں نے کانا۔ غوربند۔ چلیسر۔ لورن۔ لیلونئے وغیرہ سے لشکر جمع کرتے ہوئے میاں گل کی قیادت میں شرنلکے مقام پہ علاقہ بالبوزئے کے لشکر کو شکست دی تو میاں گل کے طرفداروں نے ملم بن ایسے ہی ایک دوسرے لشکر کو مار بھگایا۔

کش مکش زوروں پر تھی۔ میاں گل کو بہ ظاہر نواب دیر کی حمایت حاصل تھی لیکن حقیقتاً کوئی امداد بر وقت مل نہ رہی تھی۔ انہی حالات میں نخانہ کے مقام پر یوسف زیٔوں کا اجتماع (جرگہ) ہوا۔ میاں گل بھی شریک تھا۔ بحث مباحثہ کے بعد فیصلہ ہوا کہ بالوزئے کے علاقہ پر تو میاں گل کی حکومت قائم ہو اور رانجیل و موسیٰ خیل کو اس کی سیادت میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور وہ دوسرے علاقوں میں مداخلت نہ کرے۔ ساتھ ہی عبدالجبار شاہ کے لشکر سے تعاون کرتے ہوئے سوات کے علاقوں سے دیر کی سیادت کو ختم کرا دے۔ سیاسیات میں حالات بدلتے وقت نہیں لگتا۔ کل تک جس نواب دیر سے امداد و اعانت کی توقعات وابستہ کی جا رہی تھیں اب اس کے مقابلہ کی تیاری ہونے لگی۔ چنانچہ میاں گل اور عبدالجبار شاہ نے علاقہ شموزئے میں تبر نگ کے مقام پر قلعہ تعمیر کر لیا تو دیر اور سوات کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل نظر آنے لگے۔

نواب دیر نے یہ حالت دیکھی تو مقابلہ کے لئے تیاری شروع کر دی ادھر سوات میں اب بہ یک وقت دو حکمراں دکھائی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک گدڑی میں تو کئی فقیر زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک مملکت میں سما نہیں سکتے۔ اندر ہی اندر کشمکش شروع ہوئی۔ میاں گل کا پلڑا بھاری رہا۔ باشندگان وطن کو یقین ہو گیا کہ سید عبدالجبار شاہ اپنی علمی قابلیت کے باوجود قبائلی جنگ میں

نواب دیر کے مقابل ٹھہر نہ سکے گا۔ تو انہوں نے میاں گل کو حکومت مرتب کرنے کی دعوت دیدی۔ جسے میاں گل عبدالودود نے بخوشی قبول کر لیا۔ سید عبدالجبار شاہ کو ستمبر ۱۹۱۵ئہ میں عزت و احترام سے واپس لوٹا دیا گیا تو وہ پھر ستھانہ میں جا مقیم ہوا۔ اس طرح اس دور کا خاتمہ ہوا۔

سوات کے دورِ جدید کا آغاز

اب حالت یہ تھی کہ ایک طرف دیر کی طاقت مخالفت پر کھڑی تھی۔ دوسری طرف انگریز قبائلی علاقہ میں کسی منظم طاقت کے قیام کا روادار نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ریاست امب (ہزارہ) کا حکمران بھی یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ اس کے پہلو میں کوئی جدید ریاست جنم لے۔ اندرون ملک کی حالت بھی کسی طرح اطمینان بخش نہ تھی جیسے خود بانئے ریاست میاں گل یوں ظاہر کرتے ہیں۔

سوات کا علاقہ اس زمانہ میں سابق صوبہ سرحد کے اضلاع مردان و پشاور سے بالکل کٹا ہوا تھا۔ آمد و رفت کے ذرائع نہیں تھے۔ پیدل آمد و رفت تھی وہ بھی ہزاروں تکالیف اور مشکلات کے ساتھ ہوتی تھی بار برداری کے لئے خچر استعمال کئے جاتے تھے۔ نمک جیسی سستی اور عام دستیاب ہونے والی چیز جو کہ انسانی ضروریات زندگی میں اہم اور بنیادی شے ہے اس ماحول

بہں کمیاب تھی۔ تحصیل نوشہرہ کے خٹک اگر خچروں پر تجارت
کے لئے نمک لاتے تو یہاں کے لوگ خوشی سے نمک کو گھی
اور شہد کے ساتھ برابر تولنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے غرضکہ
اس قسم کے حالات تھے اور پھر سب سے زیادہ مایوس کن
امر یہ تھا کہ ان لوگوں کی وفاداری کا کوئی بھروسہ نہ تھا۔

ان حالات میں حقیقتاً حکومت کا تاج ایسے کانٹوں کا تاج
تھا جس کے بقاو قیام کی کوئی ضمانت نہ تھی۔ لیکن بایں ہمہ میاں گل نے
اس بار گراں کو اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ بیرونی حملوں کے خوف سے باشندے
متحد ہو چکے تھے۔ میاں گل نے عقل و تدبر سے کام لیتے ہوئے موقع سے فائدہ
اٹھایا۔ تا آنکہ نیکی خیل کے علاقہ میں کبل کے مقام پر ۱۹۱۵ء میں میاں گل
عبدالودود کو سوات کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا ادھر
نواب دیر نے موقع کی مناسبت سے شموزئے کے اس نصف حصہ پر بھی
قبضہ کر لیا جو کہ اس وقت تک اس کے قبضہ میں نہ تھا۔ میاں گل کو اب
طاقت میسر آ چکی تھی۔ اس نے اس طرف اقدام کرتے ہوئے پورے
شموزئے کے علاقہ پر قبضہ جما لیا۔ نواب دیر بھی خاموش بیٹھنے والا نہ تھا
۱۹۱۶ء میں اس نے دوبارہ حملہ کر دیا۔ سواتی لشکر کو شکست ہوئی
تو ایک دفعہ پھر شموزئے کے علاقہ پر دیر کا قبضہ ہو گیا۔

نواب دیر کا حوصلہ بلند ہوا تو اس نے ۱۹۱۷ء میں پھر اقدام
کیا۔ طوطالئو باندی پر حملہ ہوا۔ سواتی لشکر پاکی ڈھیری میں مقیم تھا یہیں

جنگ ہوئی دیر کا لشکر بھاگ نکلا۔ اس کے بعد بھی ایک دفعہ نواب دیر نے پھر اس علاقہ پر حصول اقتدار کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی ۱۹۱۸ء میں نواب دیر نے پھر حملہ کرتے ہوئے بہا کے مقام پر سواتیوں کو شکست دی نودہ نل اور سمبٹ میں مقیم ہو گئے لیکن جلد ہی سواتیوں نے دیر کے لشکر کو مار بھگایا۔ تو نہ صرف شموزئے کے علاقہ پر قبضہ کیا بلکہ دیر کے علاقہ ادین زئے پر بھی جا قبضہ جمایا۔ یہ میاں گل کی اولین شاندار کامیابی تھی جس نے اس علاقہ پر اس کا سکہ بٹھا دیا تھا۔

اس وقت تک ازی خیل اور جانکی خیل علاقے کسی کے زیر تسلط نہ تھے۔ میاں گل کی مذکورہ کامیابی کو دیکھتے ہوئے قبل اس کے کہ اس طرف کوئی اقدام کیا جاتا ان علاقوں کے باشندوں نے خود ہی اپنے علاقوں کو ریاست میں شامل کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک مشکل ترین دور

۱۹۲۱ء میں ایک دفعہ پھر خطرات کے بادل امنڈ آئے تو اس جدید ریاست کو مشکل ترین دور سے گزرنا پڑا۔ ملک کے اندر چند قبائل نے بغاوت کر دی دوسری طرف علاقہ بونیر میں نواب امب نے گوقند کے مقام پر حملہ کر دیا کوہستان کے لشکر نے نواب دیر کے ایماء سے مدین کے مقام پر اجتماع کیا۔ خود امب کا لشکر کوہ کڑاکڑ تک پہنچ گیا اور دیر کے جس علاقہ ادین زئے پر سواتی قبضہ کر چکے تھے اس میں بھی بغاوت ہو گئی۔ نواب دیر کو انگریز کی حمایت حاصل تھی۔ اس طرح گویا بیک وقت سوات

پانچ اطراف سے حملہ ہو رہا تھا۔ میاں گل کے لئے سخت ترین آزمائش تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ تن تنہا تگ و دو کرتے ہوئے محاذوں کی فکر میں سرگرداں رہا۔ اور اپنے عقل و تدبر سے کام لیتے ہوئے مسلسل پانچ ماہ جنگ و جدل میں مصروف رہنے کے بعد اس نے تمام مشکلات پر قابو پالیا اور تمام محاذوں پر اسے کامیابی نصیب ہوئی۔

انگریز کی مداخلت

ظاہر کیا جا چکا ہے کہ سواتیوں نے ادین زئے کے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا لواب دیر جب طاقت سے اس پر دوبارہ قبضہ نہ کر سکا تو اس نے انگریز کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ حکومت انگلشیہ سے اس کے تعلقات خوشگوار تھے۔ اس وجہ سے انگریز نے بادشاہ سوات سے مشورہ کئے بغیر اقرار کر لیا کہ ادین زئے کا علاقہ اسے دلا دے گا۔ اور یہ شرط لگا دی کہ اس کے بعد جب تک نواب دیر کو بادشاہ سوات کے مقابل دو تہائی اکثریت حاصل نہ ہو جائے وہ سوات پر لشکر کشی نہ کرے گا اور اپنے اغراض کے پیش نظر یہ شرط بھی عائد کر دی کہ ایسی حالت میں بھی نواب دیر کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ حملہ کرنے سے پیشتر پولیٹیکل ایجنٹ سے اجازت حاصل کرے۔

بادشاہ سوات پر جب یہ حقیقت کھلی اور پولیٹیکل ایجنٹ نے اسے مذکورہ معاہدہ یا اقرار کی اطلاع دی تو وہ بے بس نظر آنے لگا۔ اتنی طاقت نہیں تھی کہ بیک وقت دیر اور انگریز کی مشترکہ طاقت کا مقابلہ

کرتا۔ پھر ایسی حالت میں کہ سوات کے باشندے اپنی ضروریات زندگی کے لئے انگریزی علاقہ کے دست نگر تھے۔ اس نے خاموشی سے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور علاقہ ادین زئے کو جو حقیقت ریاست دیرہی کا حصہ تھا واپس کرنے کا اقرار کر لیا۔ اس طرح یہ علاقہ ۱۹۲۲ء میں نواب دیر کے سپرد کر دیا گیا۔

بونیر پر قبضہ

بونیر کا علاقہ اس وقت تک آزاد تھا۔ وقت ضرورت مقامی باشندے اپنے اندرونی جھگڑوں یا بیرونی حملہ کے وقت نواب دیر یا نواب ریاست امب سے امداد طلب کر لیا کرتے تھے۔ اس دوران میں کہ علاقہ ادین زئے دیر کو واپس کیا جا رہا تھا۔ علاقہ بونیر میں ریاست امب کا ایک لشکر مقیم تھا۔ بلنئے ریاست سوات نے گرد وپیش پر نظر ڈالی تو اسے اب کوہستان اور بونیر کی طرف سے خطرہ دکھائی دے رہا تھا۔ چنانچہ اس نے ان علاقوں پر قبضہ کرنے کا عزم و ارادہ کر لیا۔ اور اپنے تدبیر سے ایک طرف کوہستانیوں کو مختلف طور طریقوں سے یقین دلایا جاتا رہا کہ ریاست سوات اس طرف لشکر کشی کا کوئی ارادہ نہ رکھتی تھی۔ تو دوسری طرف بونیر میں ایسی فضاء پیدا کی جس سے ظاہر ہونے لگا کہ بادشاہ سوات اتنی طاقت ہی نہ رکھتا تھا کہ بونیر پر حملہ کر سکے۔ ان حالات میں اس کے در پردہ طرفداروں نے بونیر کے قبائل کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ ریاست امب کے لشکر کو واپس کر دیں۔ چنانچہ یہ لشکر

واپس لوٹ گیا تو فضا کو سازگار دیکھتے ہوئے ۱۹۲۳ء میں میاں گل نے بونیر کے علاقہ پر قبضہ کرلیا اور اس وقت تک ریاست سوات میں شامل اور ترقی کے راستہ پر گامزن ہے۔

بجرین وغیرہ پر قبضہ

اس دوران میں کہ بادشاہ سوات بونیر کی طرف اقدام کر رہا تھا۔ کوہستانیوں کے ایک وفد نے الحاق کی درخواست کی۔ اس وقت قاعدہ یہی تھا کہ جو علاقہ یا قبیلہ الحاق کی درخواست کرتا رسماً اس طرف لشکر روانہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مختصر سا لشکر اس طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں بجرین پہنچ کر اس لشکر نے بلاکسی پروگرام کے اس جگہ پر قبضہ کرلیا۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہوئی تو کوہستانی مقابلہ پر اتر آئے۔ شاہی لشکر کو شکست ہوئی لیکن جلد ہی امداد پہنچ گئی نتیجہ یہ کہ بلاکسی ارادہ کے بجرین تک کا علاقہ ریاست میں دکھائی دینے لگا بجرین دو دریاؤں کا مقام اتصال اور بہت خوبصورت اور دلکش مقام ہے مقبوضہ علاقوں میں نظام مکمل کرلینے کے بعد اب دوسرے ان علاقوں کی طرف نظر اٹھنے لگی کہ جن سے استحکام ریاست کو خطرہ محسوس ہوسکتا تھا چنانچہ پھر جلد ہی کانا اور چکیسر جیسے اہم قبائلی علاقوں کو ریاست میں شامل کرلیا گیا۔

انگریز سے تعلقات

قیام ریاست کے سلسلہ میں بانئے ریاست بہت ہی تدبر سے کام لے رہا تھا

جنگیں لڑی جا رہی تھیں۔ نظام قائم کیا جا رہا تھا ساتھ ہی کوشش تھی کہ ارد گرد کی کسی منتظم طاعت سے بگاڑ بھی پیدا نہ ہو۔ انگریز اپنے پہلو میں کسی جدید ریاست کے قیام کو پسند نہ کر سکتا تھا لیکن اسے مداخلت کا کوئی موقع نہ ملا۔ اس کے ساتھ بانئے ریاست کو مستقبل کی فکر بھی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں اس نے اپنے خلف الرشید محمد عبد الحق جہاں زیب خان کو اپنا ولیعہد مقرر کر دیا۔ اس وقت شہزادہ کی عمر کوئی پندرہ سال تھی اور وہ اسلامیہ کالج پشاور میں زیر تعلیم تھا۔

جب انگریز ریاست کو ہی نہ تسلیم کرتا تھا تو ولیعہد کے تسلیم کئے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ بالآخر والئی سوات نے اپنی روش سے انگریز کو ریاست کے تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا تو ۳ مئی ۱۹۲۶ء کو حکومت انگلشیہ نے ریاست سوات کو تسلیم کر لیا[1]۔ اور اسے صوبہ سرحد کے سرکاری دربار میں ایک نشست بھی عطا کی گئی۔

اب انگریز سے تعلقات بڑھنے لگے تو اسی سال محکمہ سروے کے ایک افسر مسٹر اے۔ سیٹن نے سوات اور چکیسر کے علاقوں کا سروے کیا اور جنگلات کی دیکھ بھال بھی ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں وائسرائے ہند نے مالاکنڈ ایجنسی کا دورہ کیا تو پہلی بار والئی سوات کو

---

[1] ریاست کو تسلیم کرنے کی رسم صوبہ سرحد کے چیف کمشنر مسٹر ڈکین نے سوات میں بمقام سیدو شریف ادا کی تھی۔

اس سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔ یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو حکومت انگلشیہ نے بانئے ریاست کو ۔کے ۔بی۔ ای (K.B.E) کا خطاب دیا اور اس سال اپریل میں وائسرائے ہند نے سوات میں سیدو شریف کے مقام پر ایک دربار میں اس اعزاز کی سند یا تمغہ میاں گل عبدالودود کو عطا کیا ۔اس موقعہ پر حکمران کے لقب کا مسئلہ درپیش ہوا تو میاں گل نے صاف الفاظ میں واضح کر دیا کہ قوم اسے "بادشاہ" کا خطاب دے چکی تھی۔ اس وجہ سے وہ کوئی ایسا لقب پسند نہ کر سکتا تھا کہ جو اس مذکورہ خطاب کے وقار پر اثر انداز ہو سکے۔ انگریز "بادشاہ" (ہز مجسٹی) کا خطاب اپنے "آئین کے تحت تو دے نہ سکتا تھا۔ مشکل درپیش ہوئی لیکن جلد ہی اس کا حل تلاش کر لیا گیا اور لفظی تغیر و تبدل سے "بادشاہ" کی بجائے رولر (RULER) یعنی حکمران یا والی کا لقب تجویز ہوا چنانچہ سرکاری کاغذات اور عام بول چال میں وہ "والئے سوات" پکارا جانے لگا۔

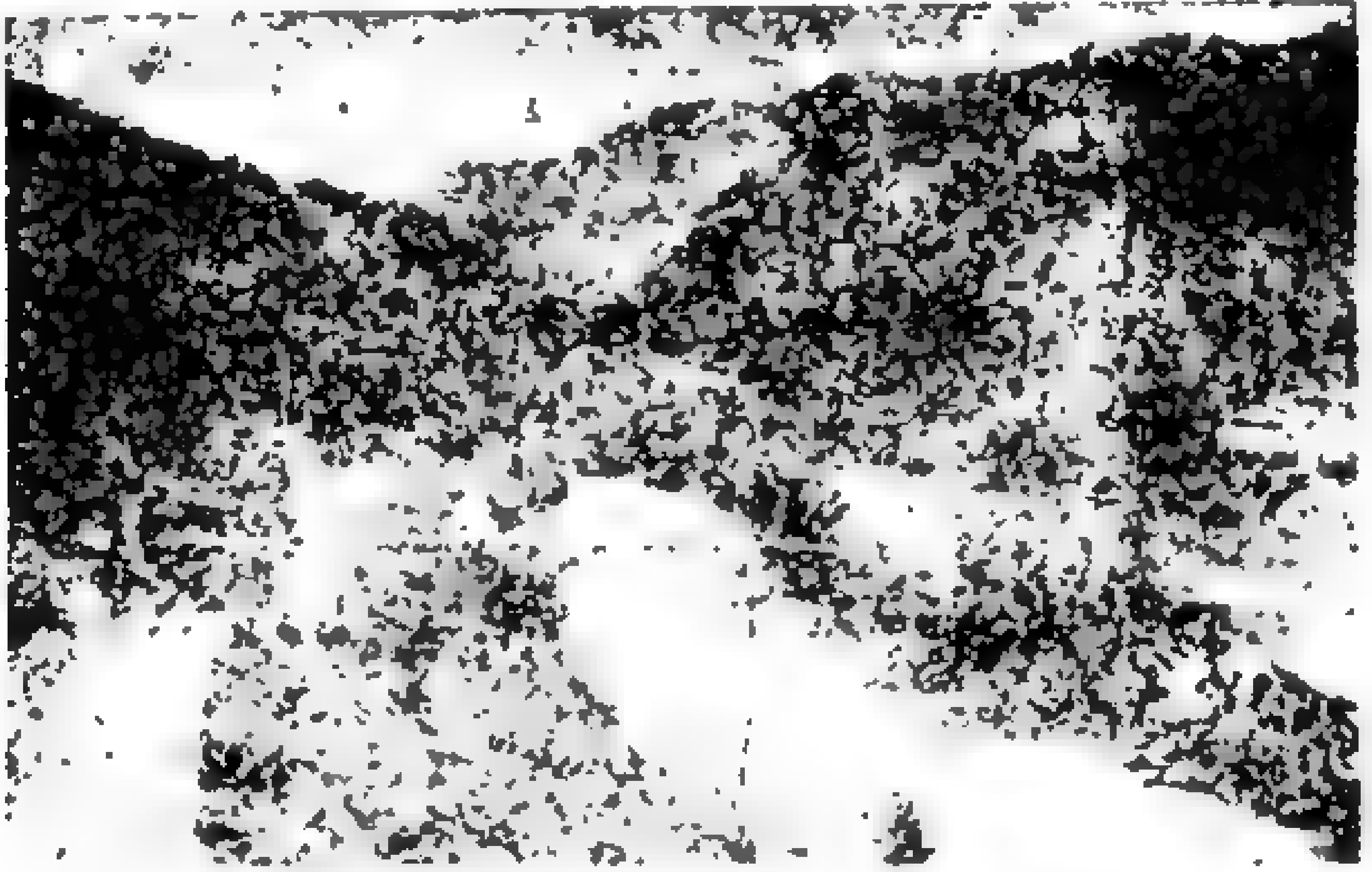
بانئے ریاست مستقبل کی فکر میں اپنا ولیعہد مقرر کر چکا تھا حکومت انگلشیہ سرکاری حیثیت میں اسے تسلیم کرنے سے پہلوتہی کر رہی تھی اور ۱۹۲۶ء میں ریاست کو تسلیم کرنے کے باوجود ولی عہد کو تسلیم نہ کیا گیا تھا۔ لیکن بانئے ریاست اپنی سعی رنمس میں مصروف رہا اور بالآخر کامیاب ہوا تو ۱۵ رمئی ۱۹۳۳ء کو گورنر صوبہ سرحد کے نمائندہ کی حیثیت سے پولیٹیکل ایجنٹ ملاکنڈ نے سیدو شریف میں ایک



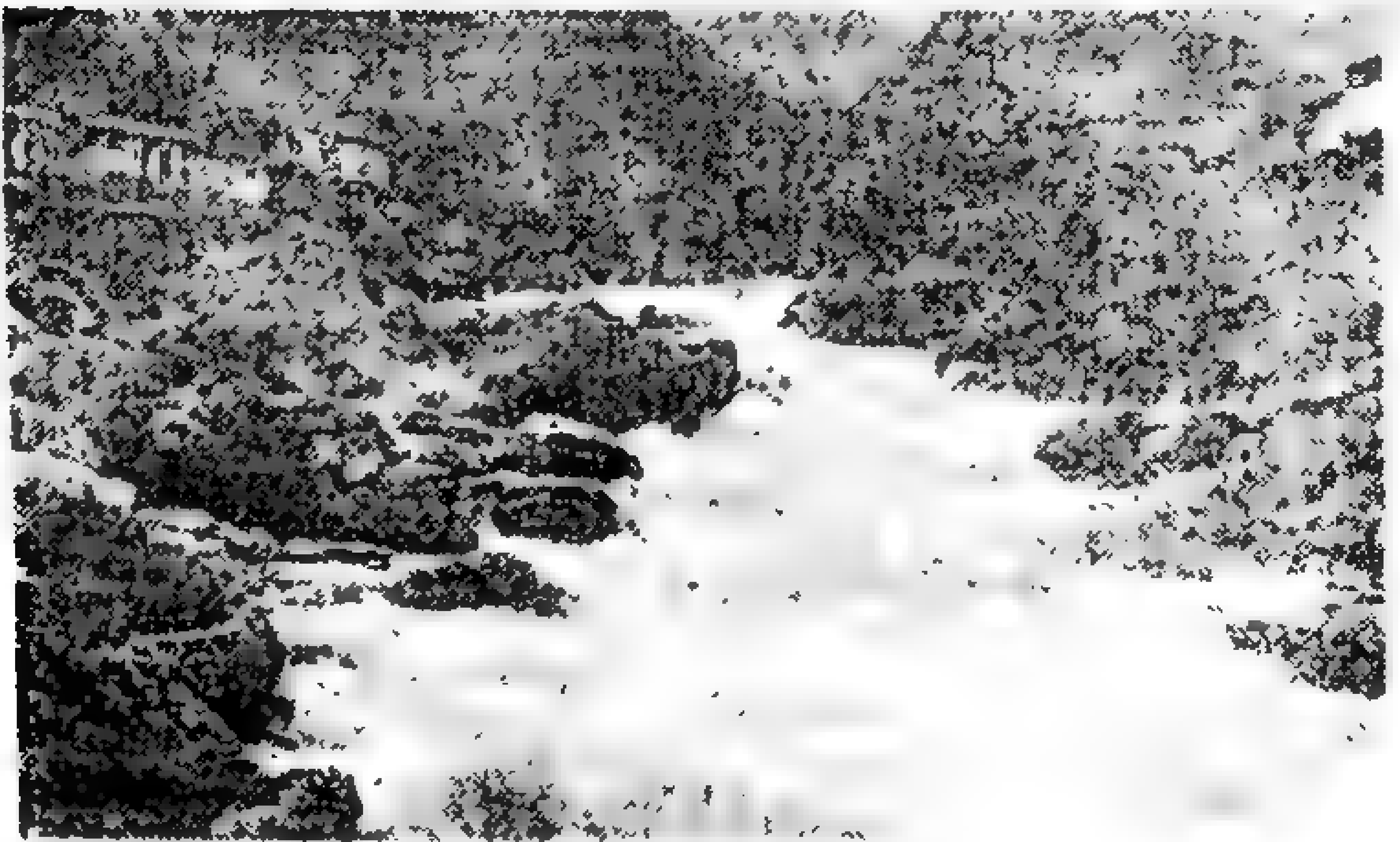
کیپٹن اورنگ زیب خان ولیعہد ریاست سوات



جدید طرز کا سوات ہوٹل



وادی کلام کا ایک منظر



بحران (سوات) کا ایک منظر

دربار منعقد کرتے ہوئے شہزادہ محمد عبدالحق جہان زیب خان کو ولی عہد تسلیم کرنے کا اعلان کردیا۔

علاقہ کوہستان پر قبضہ

۱۹۲۶ء میں انگریز کے اس ریاست کو تسلیم کرلینے کے بعد والئے ریاست کو جب یہ اطمینان ہوگیا کہ اب اس ریاست پر دیر یا امب کی طرف سے حملہ نہ ہوسکتا تھا تو اس نے ریاست کو امن اور وسعت دینے کی کوشش کی چنانچہ کوہستان کی طرف اقدام ہوا باشندگان کوہستان مقابلہ پر اتر آئے۔ طرفین کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے باوجود سواتی لشکر درہ کرامنگ۔ درہ بشام اور لاہور پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا اس کے بعد حسب معمول والئی سوات نے کوہستان میں اپنی پارٹی پیدا کرلی۔ حمایت شروع ہوئی تا آنکہ خود اس علاقہ کے باشندوں نے الحاق کی درخواست گزار دی جس پر تین اور درون یا اہم علاقوں۔ دوبیر۔ رانولیا اور بن گٹ کو ریاست میں شامل کردیا گیا۔

کوہستان کے مذکورہ اہم ترین علاقوں کو فتح کرلینے کے باوجود اس علاقہ کا مرکز پٹن آزاد تھا اور اس کے باشندے ریاست امب کے حکمران سے ساز باز رکھتے تھے۔ والئے سوات نے اس کانٹے کو بھی دور کردینا چاہا۔ لیکن مشکل یہ درپیش تھی کہ سیدو سے پٹن تک ڈیڑھ سو میل کا طویل پہاڑی راستہ تھا۔ کوئی سڑک نہ تھی۔ آمدورفت میں ہزاروں

مشکلات حائل تھیں۔ بہ ایں ہمہ لشکر کو اقدام کا حکم ملا تو یہ خطرناک پہاڑی راستہ حیرت انگیز طریقہ پر سواتی لشکر نے صرف تین دن میں طے کرتے ہوئے پٹن پر حملہ کر دیا اور شدید جنگ کے بعد اس پر قبضہ بھی کر لیا اس کے ساتھ دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ نہایت ہی تیزی سے سڑک بھی تعمیر کر لی گئی اور جب سوات کا لشکر وہاں نظام قائم کرنے کے بعد واپس لوٹا تو اپنی اسی جدید تعمیر شدہ سڑک کے ذریعہ ہی بہ اطمینان واپس لوٹا تھا۔

وادی کالام سوات کے اردگرد علاقوں کی طرف سے اطمینان حاصل کر لینے کے بعد والئ سوات نے فطرتی طور اب ان مزید علاقوں کی طرف دیکھنا شروع کیا جن کی طرف سے اس کی توسیع شدہ ریاست کو کسی خطرہ کا احتمال ہو سکتا تھا۔ اس میں خصوصیت سے وہ علاقہ بھی شامل سمجھا جا سکتا ہے کہ جو ریاست امب کی زیر سیادت یا زیر اثر تھا۔ انگریز کو ان ارادوں کا علم ہوا تو اس نے والئ سوات کو ایسے اقدامات سے روک دیا۔ اس مداخلت سے یہ تسلی ہو گئی کہ اب کسی طرف سے ریاست پر حملہ نہ ہو گا۔ چنانچہ وہ ملک کے اندرونی حالات کی طرف متوجہ ہوا اور اصلاحی کام شروع کر دیئے۔

۱۹۴۷ء میں وادی کالام کے باشندوں نے سوات کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے الحاق کی درخواست کی تو یہ علاقہ بھی ریاست میں شامل کر دیا گیا۔ لیکن حکومت مرکزیہ پاکستان نے اسے ریاست

کے صوبہ کی حیثیت دینے کی بجائے اس پر براہِ راست اپنی سیادت قائم کی اور نظام ملکی کی نگرانی کے لئے والئے ریاست کو اس کا نگران مقرر کر دیا۔ حکومت مرکزیہ پاکستان دوسرے قبائلی علاقوں کی طرح کالام کی فلاح و بہبود پر غور کرتی رہی چنانچہ دیگر اقدامات کے ساتھ اس نے فیصلہ کیا کہ کالام میں دریائے سوات پر ایک "ذخیرۂ آب" تعمیر کیا جائے اور اس کی تعمیر کے لئے اگست ۱۹۵۹ء میں کوئی تیرہ لاکھ روپے کی منظوری بھی دیدی۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس ذخیرۂ آب سے ایک وسیع علاقہ زیر کاشت آجائے گا پھر اکتوبر ۱۹۵۹ء کے دوران پولیٹکل ایجنٹ ملاکنڈ ایجنسی نے سیدو شریف کے ایک دربار میں باشندگان کالام کے جرگہ کو خطاب کرتے ہوئے ان تمام محصولات کو آئندہ کے لئے معاف کر دینے کا حکومت پاکستان کی طرف سے اعلان کیا جو شہد۔ اخروٹ۔ پھل گھی۔ بھیڑ۔ بکریاں۔ وغیرہ کی برآمد پر وصول کئے جا رہے تھے اور وادی کالام کے باشندوں کو وہ تمام مراعات دیدیں جو دوسرے قبائلی علاقوں کو حاصل ہیں۔

تحریک پاکستان

ہندوستانی قومی تحریکات کا اثر اس علاقہ سوات پر بہت ہی کم پڑا۔ اس کی ایک وجہ تو مقبوضہ علاقہ سے دوری تھی۔ دوسرے ۱۹۱۹ء (تحریک رولٹ بل) سے ۳۲-۱۹۳۱ء تک ریاست اپنی اندرونی الجھنوں میں گرفتار تھی۔ البتہ جب تحریک مسلم لیگ (پاکستان) کا آغاز ہوا تو والئے سوات کی

دوررس نگاہ نے اس کے نتائج کا اندازہ لگالیا۔ نتیجہ یہ کہ اس تحریک سے پورا تعاون ہوا۔ نہ صرف اپنے علاقہ میں بلکہ بیرون علاقہ سوات میں بھی وہ اپنے زیر اثر افراد کو اس تحریک میں شمولیت پر آمادہ کرتا رہا۔ والئی سوات نے مالی امداد سے بھی گریز نہ کی اور اس وقت کہ صوبہ سرحد میں استصواب رائے عامہ کی تحریک چل رہی تھی۔ اس نے ایک لاکھ دس ہزار روپے مسلم لیگ فنڈ میں پھر پانچ لاکھ روپے قائد اعظم فنڈ میں اور کوئی تین لاکھ روپے دوسرے فنڈوں میں دیئے پاکستانی ریاستوں کے مرکز پاکستان سے الحاق کے سلسلہ میں ریاست سوات کو اولیت کا فخر حاصل رہا اور اعلان الحاق کے ساتھ والئے سوات نے اس وظیفہ سے بھی جو کہ انگریز کے وقت سے مل رہا تھا دستبرداری کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی ایک لڑاکا ہوائی جہاز بھی خرید کر حکومت پاکستان کی نذر کیا۔

محاذ کشمیر جب قیام پاکستان کے لعد جنگ کشمیر شروع ہوئی صوبہ سرحد کے قبائل نے مجاہدانہ انداز میں شمولیت کی تو باشندگان سوات بھی ان کے پہلو بہ پہلو دکھائی دیتے رہے خود والئی سوات نے اس تحریک کی نگرانی کی۔ وہ اپنے خرچ پر مجاہدین کو محاذ کشمیر تک پہنچاتا اور واپس لاتا رہا۔ بہت سے مجاہدین شہید ہوئے اور بڑی تعداد زخمیوں کی بھی تھی اور یہ سب امداد و اعانت غیر مشروط تھی چنانچہ خود والئی سوات نے ایک موقع پر کہا:۔

پاکستان کی سلامتی ہماری سلامتی ہے۔ پاکستان کا استحکام ہمارا استحکام ہے......... پاکستان سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے۔ اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ملت اسلامیہ کی حیات ثانیہ کے سلسلہ میں پاکستان اہم پارٹ ادا کرے گا۔

محاذ کشمیر پر بہ یک وقت آٹھ سو منظم سواتی مجاہدین موجود رہا کرتے تھے۔

حکومت سے دستبرداری

ایک عرصہ دراز کی تگ و دو کے بعد جب ایک مستقل اور پائدار ریاست ترقی کی طرف گامزن نظر آنے لگی تو کوئی تریسٹھ سال کی عمر میں بانئے ریاست نے بخوشی خود حکومت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا اور عنان سلطنت شہزادہ محمد عبدالحق جہاں زیب خان کو سونپ کر (جسے ۱۹۲۳ء میں وہ اپنا ولی عہد مقرر کرچکا تھا) اسے اپنے نقش قدم پر چلانے کی کامیاب سعی کی۔ دستبرداری کی یہ تقریب نواب زادہ لیاقت علی خان وزیر اعظم حکومت پاکستان کے ہاتھوں ۱۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بمقام سیدو شریف انجام پائی۔

بانئے ریاست سوات میاں گل عبدالودود اپنے وقت کا کامیاب ترین حکمران ثابت ہوا اس نے صدیوں کی غیر منظم۔ غیر تعلیم یافتہ اور کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے والی قوم کو اتحاد و تنظیم کا سبق پڑھایا ان کی اپنی ریاست قائم کی۔ ملک کو ترقی کے راستہ پر گامزن کیا۔ زندگی

کی سہولتیں مہیا کیں۔ تعلیم وصحت کا انتظام کیا۔ اور خطہ سوات کو تاریخ کے اوراق میں ایسی جگہ دلادی کہ دوسری کوئی ہم عصر ریاست اس کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اور پھر اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب کامیابی اور کامرانی۔ دور اندیشی۔ تدبر اور نظم ونسق اس شخص نے قائم کیا جو تعلیم جدید کا تو ذکر ہی کیا تعلیم قدیم سے بھی بہرہ ور نہ تھا اور جسے اپنے ذاتی خطوط یا کاروبار حکومت کے سلسلہ میں بھی دوسرے لکھنے والوں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ ایسی حالت میں تعلیم کی وقعت اس کی نظر میں اور بھی بڑھ گئی۔ آپ مصروف اور جنگ وجدل سے بھر پور زندگی میں وہ خود تو تعلیم حاصل نہ کر سکا لیکن اپنے خاندان اور قوم کو اس نعمت سے محروم نہ رہنے دیا۔ اپنے لڑکوں کو تعلیم دلائی اور قوم کے لئے ریاست میں مدرسوں کا جال بچھا دیا اور وہ سب کچھ کر دکھایا جو دور حاضر کا کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ حکمران کر سکتا تھا۔

تعلیم کی تشنگی کو وہ خود بھی محسوس کرتا رہا اور جب حکومت سے دستبردار ہوا تو اس نے اپنی اولین فرصت میں تعلیم کی طرف توجہ دی چنانچہ وہ خود کہتا ہے کہ :

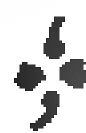
میں نے تراسیٹھ سال کی عمر میں تعلیم حاصل کرنا شروع کی تھی

ریاست سوات کے قیام وترقی میں بانئے سوات کی ہمت واستقلال اور جرأت ودلیری کے ساتھ عقل وتدبر نے کارہائے نمایاں کر دکھلائے اس

نے جس طرف کا رخ کرنا چاہا پہلے اس علاقہ میں اپنے طرفدار پیدا کیے۔ ہر حمایت کے مقابل مخالفت کا پیدا ہونا یقینی دلازمی تھا۔ نتیجہ یہ کہ مخالف پارٹی پر اس کی طاقت ظاہر ہو جاتی تھی تو وہ اس خیال سے کہ حمایت کرنے والے انعام واکرام کے مستحق سمجھے جائیں گے۔ از خود یا نئے ریاست کے تدبر کا شکار ہو کر طرفداری سے قبل ہی اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔ علاوہ ازیں جس علاقہ کو اس نے ریاست میں شامل کیا۔ وہیں کے افراد کو اچھے عہدے دیئے اور اس علاقہ کے افراد کو جب کبھی مرکزی مقام سیدو شریف میں آنے کا اتفاق ہوا تو ان سے بڑی محبت سے پیش آیا، اور ان کی مہمانوں کی سی آؤ بھگت ہوئی۔ اس کا طریقہ کار اس کے اپنے الفاظ سے یوں ظاہر ہوتا ہے۔

> جس علاقہ کو ہم فتح کر لیتے تھے اس کے باشندوں سے شفقانہ برتاؤ کیا جاتا ہم ان لوگوں کے دل محبت اور پیہم مہربانیوں سے جیت لیتے تھے جب دوسرے علاقوں کے لوگ یہ حالات دیکھتے تو خود بخود حکومت میں شامل ہو جاتے تھے۔

اس نے ریاست میں عدالتیں قائم کیں۔ فوج و پولیس کا انتظام کیا ڈاک خانوں کا اجراء ہوا۔ تجارت کی طرف توجہ دی گئی اور علاقہ سے جاہلانہ رسومات کو ختم کر دیا۔



عہدِ جہاں زیب خان

حدود اربعہ

۱۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو عنان سلطنت سنبھالنے کے بعد میاں گل عبدالحق جہاں زیب خان نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے کی کامیاب سعی کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ریاست دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اس وقت یہ ریاست ملک کی اہم ترین ترقی یافتہ ریاست ہے کہ جس کا قبائلی علاقہ میں وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے شمال میں ریاست دیر ہے تو مشرق میں علاقہ ہزارہ۔ جنوب میں ضلع مردان ہے تو شمال میں حکومت چترال۔ بلند و بالا پہاڑ ان میں زراعت کے لئے کھلے میدان۔ دریائے سوات کی آب پاشی سے تو یہ علاقہ زمانہ قدیم سے اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور تھا ہی۔ دور جدید میں مزید نہروں کے ذریعہ آبپاشی کی ترقی۔ راستوں کی سہولت اور ندی نالوں پر پلوں کی تعمیر نے اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

آبادی و پیداوار ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس ریاست میں کوئی ساڑھے پانچ لاکھ نفوس آباد ہیں۔ باشندے اندازاً اسی فیصدی زراعت پیشہ دکھائی دیتے ہیں۔ ملک دریائے سوات۔ دوسرے ندی نالوں اور نو تعمیر شدہ نہروں کے ذریعہ سیراب ہوتا ہے۔ چاول گندم۔ جوار۔ جو اور دالوں کے علاوہ مختلف اقسام کے میوے بکثرت پیدا ہوتے ہیں اور سرسوں بڑی تعداد میں بوئی جاتی ہے۔ جڑی بوٹیوں کی بھی کوئی کمی نہیں اور معدنیات کے ذخائر کا بھی پتہ چلتا ہے جن سے استفادہ کا اس وقت تک کوئی منظم اقدام نہیں ہوا۔

جانوروں میں گائے بھینس بکریاں وغیرہ بکثرت دکھائی دیتی ہیں۔ دودھ مکھن گھی کی افراط ہے اور بڑی مقدار میں یہ اشیاء درجہڑہ برآمد کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں شہد بھی اس علاقہ میں وافر مقدار میں دستیاب ہوتا ہے اور اسے خاص مقدار میں ملک سے باہر بھیجا جاتا ہے۔ اگر اس تجارت کو بھی منظم کیا جائے تو غالب خیال ہے کہ پاکستان کو بیرونی ممالک سے شہد درآمد کرنے کے سلسلہ میں نجات مل سکتی ہے۔

راستے قیام ریاست سے قبل اس علاقہ میں نام کو کوئی سڑک دکھائی نہ دیتی تھی۔ اور جہاں زمانہ قدیم کی پگڈنڈیاں ہی ذریعہ آمدورفت کا کام دیتی تھیں۔ وہاں اس وقت چار سو میل سے زائد عمدہ پختہ سڑکیں موجود ہیں۔ جن پر چھوٹی گاڑیوں سے لیکر بھاری ٹرک

تک دوڑتے نظر آتے ہیں۔ دریا اور ندی نالوں پر خوبصورت پل بنا دیئے گئے ہیں۔ عمدہ پختہ عمارتیں نظر آرہی ہیں۔ سیدو شریف اور مدین میں مہمانوں اور سیاحوں کے لئے عمدہ قسم کے ہوٹل موجود ہیں اور بعض دوسرے مقامات پر ڈاک بنگلے یا ریسٹ ہاؤس بھی نظر آتے ہیں۔ حکومت پاکستان جلد ہی سوات میں ایک ہوائی مستقر بھی تعمیر کرنے کا بندوبست کر رہی ہے۔ جو عوام اور سیاحوں کے کام آئے گا۔

تعلیم تعلیم کے سلسلہ میں ریاست حیرت انگیز طریقہ پر ترقی کر رہی ہے۔ جہاں زیب ڈگری کالج ریاست اور بیرون ریاست کے طلبا کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کی خوبصورت عمارت۔ طلبا کے لئے دلکش رہائش گاہیں اور کھیل کے میدان۔ معلمین کے لئے صاف ستھرے بنگلے اپنے اندر خاص کشش رکھتے ہیں۔ ریاست کے طول وعرض میں مدارس کا جال بچھایا جا چکا ہے۔ شاید کوئی چھوٹی سے چھوٹی آبادی ایسی ہو کہ جہاں بچے حصول تعلیم میں کوئی دقت یا مشکل محسوس کرتے ہوں۔ متعدد ہائی اسکول ہیں۔ اپر مڈل اور لوئر مڈل بھی بڑی تعداد میں بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں مصروف ہیں۔

ابتدائی پرائمری جماعتوں سے لے کر کالج سے ڈگری حاصل کرنے تک تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ جس کی مثل برصغیر پاک و ہند میں دکھائی نہیں دیتی۔ مزید براں نادار طلباء کے لئے خاص فنڈ قائم کیا جا چکا ہے جس سے مستحق طلباء کو کتابیں لباس اور دیگر ضروریات مہیا کی جاتی ہیں

اور علاوہ ازیں بڑی تعداد میں طلبار کو وظائف دے کر ریاست انہیں فنی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے پاکستانی اداروں میں داخل کراتی ہے

صحت اس علاقہ میں ملیریا اور اس قسم دوسری بیماریاں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ لیکن صحت عامہ کی طرف ریاست کی توجہ نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کرلی ہے۔ ریاست میں نصف درجن سے زائد بڑے ہسپتال ہیں۔ بیس کے قریب چھوٹے دواخانے (ڈسپنسریاں) ہیں اور ان کے ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کا شفاخانہ حیوانات بھی ہے اور چند سفری شفاخانے بھی کام کر رہے ہیں۔

ڈاک و تار سلسلہ ڈاک و تار بھی بہ طریق احسن کام کر رہا ہے سیدو شریف میں ایک اچھا ڈاک خانہ و تار گھر ہے اور ریاست کے مختلف حصوں میں کوئی بیس کے قریب چھوٹے ڈاک خانے مصروف عمل ہیں۔ ٹیلیفون کا سلسلہ بھی موجود ہے اور ریاست میں ہر طرف ٹیلیفون کے تار دوڑتے دکھائی دیتے ہیں جن کی اندازاً لمبائی ڈیڑھ دو ہزار میل ہوگی اس سلسلہ ٹیلیفون کو مالاکنڈ ایجنسی ایکسچینج کے ذریعہ پاکستان سے ملایا جاچکا ہے۔

بجلی دور حاضر کی دوسری اہم ضروریات کے ساتھ اس وقت ریاست کی شاہراہ پر آباد تمام مقامات تک مالاکنڈ پاور ہاؤس سے قوت برق پہنچائی جاچکی ہے اور بجلی کی روشنی ایسے علاقوں کو میسر ہے کہ جہاں اس کے پہنچنے کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

جنگلات ریاست سوات میں جنگلات بکثرت ہیں جن سے بڑی مقدار میں لکڑی برآمد کی جاتی ہے۔ یہ لکڑی دریائے سوات کے ذریعے بیرونی علاقوں کو جاتی اور حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ابتدا میں یہ کاروبار انفرادی حیثیت سے ہوتا تھا لیکن ملک میں کسی منظم حکومت کے عدم وجود سے اسے نہ کوئی خاص اہمیت حاصل ہوئی نہ اس دولت سے فائدہ اٹھایا گیا بعد میں جب ایک منظم ریاست قائم ہوگئی اور حکومت انگلشیہ نے اسے تسلیم کر لیا تو ۱۹۲۷ء میں اس کے جنگلات کی طرف توجہ منعطف ہوئی ایک ماہر جنگلات مسٹر پیٹل نامی کو تحقیقات کے لئے بھیجا گیا اور پھر اس کا پیش کردہ رپورٹ کی روشنی میں جنگلات سے فائدہ اٹھانے کی اسکیم مرتب کرنے کے لئے ایک ماہر افسر خان صاحب الیار کی خدمات حاصل کی گئیں تو ابتدا پیڈ نگ ڈنگا سنگھ اینڈ کمپنی کو لکڑی برآمد کرنے کا اجارہ دیا گیا لیکن وہ ادارہ زیادہ دیر تک کام نہ کر سکا تو پھر دوسرے ذرائع استعمال ہوئے۔

بالآخر حکومت سوات نے اس طرف توجہ دینا شروع کی تو محکمہ جنگلات کا قیام عمل میں آیا جس نے وزیر مال کی سرکردگی میں اس دولت سے مستفید ہونے کے لئے اقدامات شروع کئے۔ اس سلسلہ میں ریاست کو حکومت پاکستان کے محکمہ جنگلات کا تعاون حاصل رہا۔ اور درختوں کی کٹائی اس محکمہ کی نشان دہی پر ہونے لگی۔ کٹائی کے بعد حکومت سوات

انہیں عام نیلام کے ذریعہ فروخت کرتی ہے اور اس نیلام میں مقامی یا بیرون ریاست سے آئے ہوئے ٹھیکیدار آزادانہ بولی دے سکتے ہیں اس طرح اب یہ جنگلاتی لکڑی بڑی مقدار میں منظم طریقہ پر برآمد کی جاتی ہے۔

صنعت گھریلو صنعت نجی طریقہ پر کی جارہی ہے۔اس کی ترقی کی طرف اس وقت تک کوئی قابل ذکر اقدام نہیں ہوا۔ اگر اس صنعت کو امداد باہمی کے طریقہ پر چلایا جائے تو ملک اور اہل ملک کے لئے بہت ہی مفید ہوسکتی ہے اون اور اون کی بنی ہوئی اشیاء جو اب محدود تعداد میں برآمد کی جاتی ہیں صنعت کے منظم ہوجانے پر باشندوں کی مالی حالت سنوارنے میں بڑی حد تک ممد و معاون ہوسکتی ہیں سوات کے کمبل اور دوسری ایسی اشیاء کو پاکستان اور بیرون پاکستان تک میں مقبولیت حاصل ہے۔

نظام نظام ملکی کی سرانجام دہی کے لئے ریاست کو بتیس تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر تحصیل کا حاکم تحصیلدار کہلاتا ہے پھر ان تحصیلوں کے گروپ یا صوبے بنا کر ہر گروپ پر ایک افسر مقرر ہے جو حاکم پکارا جاتا ہے۔ جس کے کام کی نگرانی وزرائے ریاست کرتے ہیں جن میں سپہ سالار افواج بھی شامل ہے اور آخری اپیل حکمران یا "والی" کی سماعت کے لئے پیش ہوتی ہے عدالتوں میں اسٹامپ وغیرہ کا طریقہ رائج کردیا گیا ہے لیکن حصول انصاف میں کسی شکل یا ناقابل برداشت اخراجات کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ عام طور مقدمات کی سماعت کم سے کم

وقت میں کی جاتی ہے اور وقت ضرورت مظلومین بلا جھجک والی تک جا پہنچتے ہیں۔

پولیس اور فوج

پولیس اور فوج کے نوجوان بڑے چست اور چوبند نظر آتے ہیں قیام امن کے لئے ریاست کے طول و عرض میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت قلعے تعمیر ہیں جن میں فوج یا پولیس کے افراد حسب ضرورت رکھے جاتے ہیں ان کے پاس جدید قسم کا اسلحہ ہے اور دار السلطنت میں ٹریفک پولیس بڑی مستعدی سے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ قیام ریاست سے قبل دوسرے قبائلی علاقوں کی طرح اس علاقہ میں بھی اسلحہ رکھنے پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی لیکن بانئے سوات نے حالات سے مجبور ہو کر پابندی عائد کر دی اب ہر شخص کو لائسنس لینا پڑتا ہے اور یہ لائسنس ایک روپیہ سالانہ ٹیکس ادا کرنے پر ملتا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے اس طریقہ رائج کرنے سے بانئے ریاست کا مقصد اپنی ریاست میں اسلحہ کی تعداد کو پیش نظر رکھنا تھا پاکستان کی طرف سے ریاست میں لنڈاکئے کے مقام پر جہاں سے ریاست کی سرحد شروع ہوتی ہے اور جہاں محصول کی چوکی بھی ہے لائسنس دیکھے جاتے ہیں۔

باشندوں کی حالت

ریاست سوات کے کوہستانی علاقہ کی بعض قومیں مثلاً گوجر، اجڑ وغیرہ خانہ بدوش زندگی گزارتی ہیں وہ صرف موسم گرما میں، جبکہ انہیں مویشیوں کے لئے گھاس بکثرت ملتا ہے ان علاقوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ زراعت پیشہ نہیں ہیں۔

صرف دودھ گھی وغیرہ بیچنے پر اپنا گزارہ کرتے ہیں۔ موسم سرما میں جب ان علاقوں میں برف پڑتی ہے تو گھاس کی تلاش میں یہ لوگ پاکستان کے میدانی علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔ اگر سچ پوچھا جائے تو یہ لوگ سال کا زیادہ تر وقت پاکستان کے میدانی علاقوں میں گزارتے ہیں اور صرف تین چار ماہ کے لئے ان علاقوں میں چلے آتے ہیں۔

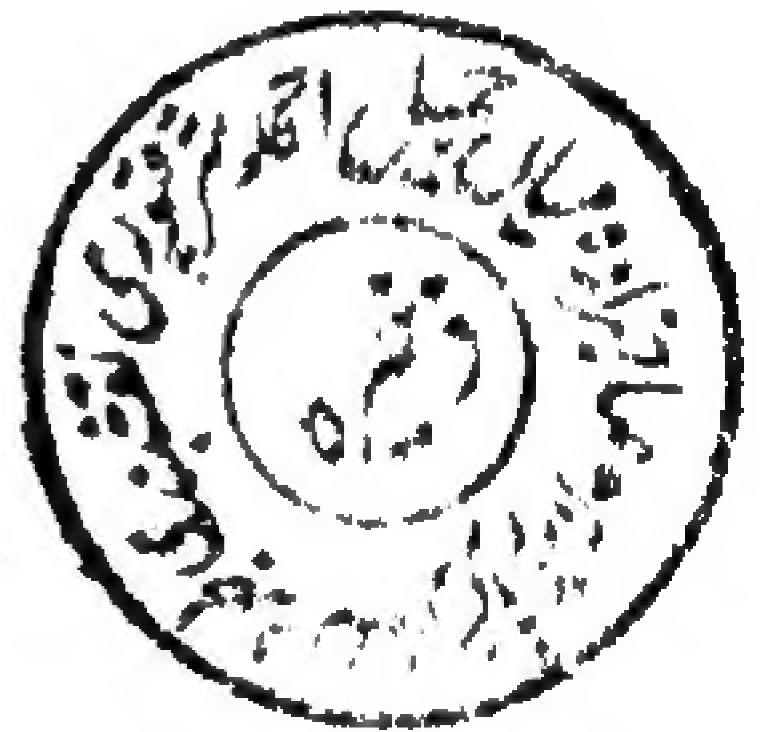
والئے سوات والئے سوات محمد عبدالحق جہاں زیب خان اسلامیہ کالج پشاور کے تعلیم یافتہ خوش خلق خندہ رو اور ہر شخص سے بڑے اخلاص سے پیش آتے ہیں۔ انہیں کاروبار حکومت سے ازحد دلچسپی ہے شب و روز اس میں منہمک رہتے ہیں اور دن نکلتے ہی دفتر پہنچ جاتے ہیں جہاں کاروبار حکومت کو سرانجام دینے کے ساتھ عوام و خواص سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ ملاقاتوں پر کسی قسم پابندی عائد نہیں۔ ہر شخص بلا تکلف ان سے مل سکتا ہے۔ وہ سختی سے اس امر کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کے جاری کردہ احکام کی بروقت تعمیل ہو۔ ریاست کے دفاتر جمعرات کے دن بند رہتے ہیں اس دن شاہی خاندان کے قریب قریب تمام افراد شکار کھیلتے ہیں۔ والی صاحب صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں اور جمعہ کے دن عام طور تمام خاندان بانئے ریاست کے ساتھ یکجا نماز جمعہ ادا کرتا ہے۔ ریاست کی سرکاری زبان پشتو ہے جس میں گفتگو کو والی پسند کرتے ہیں۔

ولیعہد وغیرہ جہاں زیب خان کے چار لڑکے ہیں اورنگ زیب خان عالم زیب خان۔ امیر زیب خان۔ امجد زیب خان

ان میں سب سے بڑے کپتان محمد اورنگ زیب خان کو انہوں نے اپنا ولی عہد مقرر کر لیا ہے۔ ولی عہد کی شادی ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان کی دختر نیک اختر سے اس وقت ہوئی تھی جب آپ افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف تھے۔

دعا ہے کہ رب العزت اس اسلامی ریاست کو مفاد ملت اسلامیہ کے لئے دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

ختم



YUSUFZAI

یوسف زئی

یعنی

ضلع مردان. ریاست سوات، دیر، علاقہ بونیر، باجوڑ وغیرہ کی

اولین تاریخ

جو اس قبیلہ کے موجودہ علاقہ میں

۵۰۰ سال

قبل آنے کے بعد پہلی مرتبہ لکھی گئی ہے۔

(۵)

فہرست مضامین مفت طلب کریں۔

محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی (تین ہٹی) کراچی ۵